مزاحمتی رویے اور شاعری: گلگت بلتستان کی اردو شاعری میں مزاحمت کے سیاسی و سماجی زاویوں کا مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

مصطفیٰ عباس

ایم فل (اُردو) سکالر

رجسٹریشن نمبر:۱۷۳۹/M/U/S19

نگران:

ڈاکٹر ظفر احمد

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز

اسلام آباد

فیکلٹی آف ماڈرن لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

مزاحمتی رویے اور شاعری: گلگت بلتستان کی اردو شاعری میں مزاحمت کے سیاسی و سماجی زاویوں کا مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

مصطفیٰ عباس

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جون، ۲۰۲۱

مزاحمتی رویے اور شاعری: گلگت بلتستان کی اردو شاعری میں مزاحمت کے سیاسی و سماجی زاویوں کا مطالعہ

مقالہ نگار:

مصطفیٰ عباس

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جون، ۲۰۲۱

مقالے کے دفاع کی منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے ،وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: مزاحمتی رویے اور شاعری: گلگت بلتستان کی اردو شاعری میں مزاحمت کے سیاسی و سماجی زاویوں کا مطالعہ

پیش کار: مصطفیٰ عباس رجسٹریشن نمبر:1739/M/U/S19

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان و ادب

ڈاکٹر ظفر احمد

------ -------

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر شاہد صدیقی ----------

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان ----------

پرو ریکٹر اکیڈمکس

---------- تاریخ

اقرار نامہ

میں مصطفیٰ عباس حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے ایم فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر ظفر احمد کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

مصطفیٰ عباس

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جون ۲۰۲۱

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالے کے دفاع کی منظوری کا فارم	ii
اقرار نامہ	iii
فہرست ابواب	iv
Abstract	vii
اظہار تشکر	Viii
باب اول: موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث	صفحہ ۱ تا ۲۹
الف۔ تمہید	۱
i۔ موضوع کا تعارف	۱
ii۔ بیان مسئلہ	۲
iii۔ مقاصد تحقیق	۲
Iv۔ تحقیقی سوالات	۳
v۔ نظری دائرہ کار	۳
vi۔ تحقیقی طریقہ کار	۴
vii۔ موضوع پر ما قبل تحقیق	۴
Viii۔ تحدید	۵
ix۔ پس منظری مطالعہ	۵
X۔ تحقیق کی اہمیت	۶
ب بنیادی مباحث	۷
i. مزاحمت کیا ہے؟	۹

ii. مزاحمت سیاسی بحث ۱۲

iii. مزاحمت سماجی بحث ۱۴

iv. اردو شاعری میں مزاحمتی عناصر کا مختصر جائزہ ۱۷

v. گلگت بلتستان کا مختصر ادبی منظر نامہ ۲۳

حوالہ جات ۲۸

باب دوم: گلگت کے منتخب اردو شعراء کی شاعری میں مزاحمت کے سیاسی و سماجی زاویوں کا مطالعہ ۳۰تا ۶۶

الف۔ گلگت کے اہم شعراء کا تعارف ۳۰

ب۔ گلگت کی اردو شاعری میں مزاحمت کے سیاسی زاویے ۳۹

ج۔ گلگت کی اردو شاعری میں مزاحمت کے سماجی زاویے ۵۳

حوالہ جات ۶۴

باب سوم: بلتستان کے منتخب اردو شعراء کی شاعری میں مزاحمت کے سیاسی و سماجی زاویوں کا مطالعہ ۶۷تا۱۰۷

الف۔ بلتستان کے اہم شعراء کا تعارف ۶۷

ب۔ بلتستان کی اردو شاعری میں مزاحمت کے سیاسی زاویے ۷۵

ج۔ بلتستان کی اردو شاعری میں مزاحمت کے سماجی زاویے ۹۰

حوالہ جات ۱۰۵

باب چہارم: گلگت اور بلتستان کے منتخب اردو شعراء کے ہاں مزاحمتی زاویوں کا تقابلی مطالعہ ۱۰۸تا۱۳۱

الف۔ گلگت اور بلتستان کی شاعری میں سیاسی مزاحمتی زاویوں کا تقابلی جائزہ ۱۰۸
ب۔ گلگت اور بلتستان کی شاعری میں سماجی مزاحمتی زاویوں کا تقابلی جائزہ ۱۱۷
ج۔ گلگت اور بلتستان کی اردو شاعری میں مزاحمتی سطح پر پائے جانے والے اشتراکات ۱۲۵
د۔ گلگت اور بلتستان کی اردو شاعری میں مزاحمتی سطح پر پائے جانے والے افتراقات ۱۲۷
حوالہ جات ۱۳۰
باب پنجم: مجموعی جائزہ ۱۳۲تا۱۵۴
الف۔ مجموعی جائزہ ۱۳۲
ب۔ تحقیقی نتائج ۱۴۶
ج۔ سفارشات ۱۴۷
کتابیات ۱۴۸

Abstract

Title: Resistance Behavior and Poetry: A Study of Political and Social Angles of Resistance in Urdu Poetry of Gilgit -Baltistan

Abstract:

Resistance is not a new phenomenon. It has always been a topic of Urdu's literary works. That's why, during the last few decades resistance literature has become very popular in Urdu.

In Gilgit-Baltistan's Urdu poetry, there are different dimensions and angles of resistance. This thesis consists of a study of political and social angles of resistance in Urdu poetry of Gilgit-Baltistan.

This thesis consist of five chapters: the first chapter consist of introduction of theme, key term of study ,background ,its scope, research questions, objectives, introduction of resistance ,political and social angles of resistance, short review of resistance in Urdu poetry and short review of literature background of Gilgit-Baltistan.

Second chapter consist of an introduction of selected Urdu poets of Gilgit region and different angles of political and social angles of resistance in their Urdu poetry has been discussed with example.

In third chapter introduction of selected Urdu poets of Baltistan region and political and social angles of resistance in their Urdu poetry were also been discussed with example.

The fourth chapter consist of comparative study between Gilgit and Baltistan Urdu poetry. Whereas the fifth chapter includes overall review, findings of the study and d recommendation of research.

اظہار تشکر

تمام تعریفیں عالمین کے پروردگار کے نام جس نے نرم ونازک انگلیوں کی پوروں میں قلم تھما کر علم کی لامحدود شاہراہیں کھول دیں۔ انگنت درود و سلام ہو نبی آخر الزمانؐ اور اُن کی آل پر جو وجہ تخلیق کائنات بنی۔ اللہ تعالی کے فضل و کرم سے میرا ایم۔فل (اردو) کا تحقیقی مقالہ پایہ تکمیل تک پہنچا۔ میں نے اس تحقیقی مقالے کے ذریعے گلگت بلتستان کے معتبر اردو شعراء کو گوشہ گمنامی سے نکال کر علمی و ادبی حلقوں میں متعارف کرانے کی ایک ادنیٰ سی کوشش کی ہے۔

اپنے عزیز والدین کا شکریہ ادا کرنا فرضِ عین سمجھتا ہوں۔ جنھوں نے ہر قسم کی مشکلات کے باوجود میری تعلیم و تربیت کا سلسلہ کبھی رکنے نہیں دیا۔ یہ بات سچ ہے کہ یہ تحقیقی کام بغیر کسی رہنمائی کے پایہ تکمیل تک پہنچنا مجھ جیسے کمزور طالب علموں کے لیے ناممکن کام ہے۔ اس ضمن میں اپنے نگرانِ مقالہ ڈاکٹر ظفر احمد صاحب کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اس تحقیقی مقالے کی ابتداء سے لے کر تکمیل تک قدم قدم پر رہنمائی کرتے رہے اور مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔ یقیناً ان کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کے بغیر اس تحقیقی کام کو تکمیل تک پہنچانا میرے لیے مشکل کام تھا۔ مگر اُن کی دستِ شفقت نے اس مشکل سفر کو میرے لیے آسان بنا دیا۔

میں اپنے دیگر اساتذہ ڈاکٹر عابد حسین سیالؔ، ڈاکٹر محمد شفیق انجمؔ، ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر محمود الحسن، ڈاکٹر نازیہ یونس، ڈاکٹر ارشاد بیگم، ڈاکٹر رخشندہ مراد، ڈاکٹر صائمہ نذیر اور ڈاکٹر صنوبر الطاف کا علمی و ادبی اور تحقیقی سطح پر رہنمائی کرنے اور مفید مشوروں سے نوازنے پر شکریہ ادا کرتا ہوں۔

تحقیقی مواد کی حصول کو آسان بنانے کے لیے محترم یعقوب عروجؔ صاحب، عبدالخالق تاجؔ، جمشید دکھیؔ، حبیب الرحمٰن مشتاقؔ، احسان شاہ، اکبر حسین نحویؔ، عبدالحفیظ شاکرؔ، عاشق حسین عاشقؔ، ڈاکٹر مولا داد شفاء، نوجوان شاعر نیاز نیازیؔ اور عزیز دوست شبیر احمد کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

آخر میں ایک بار پھر اپنے عزیز والدین، پیارے بھائی یاور آخوندی، جان سے پیاری بہن حکیمہ خاتون اور ہم سب کی لاڈلی بہن زہرا بتول کا شکریہ، جن کی تعاون کے بغیر اس منزل تک پہنچنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔

مصطفیٰ عباس (مصطفیٰ ادیبؔ)

سکالر ایم فل اردو

باب اول

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید

i. موضوع کا تعارف

ادب انسانی زندگی کو براہ راست متاثر کرتا ہے۔ اور یہ سماج کو شعور کی آگاہی فراہم کرنے کا بہترین ذریعہ بھی بنتا ہے۔ عالمی ادبی سرمائے کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ شائید ہی کوئی ایسا ادیب یا شاعر ہو جس کے دل و دماغ کو ظلم و جبر نے نہ جھنجوڑا ہو۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ادب میں مزاحمتی فکر کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔

لفظ مزاحمت کا لغوی معنی "روک ٹوک"، "ممانعت" اور "تعرض" وغیرہ لیا جاتا ہے۔ اصطلاح میں مزاحمت سے مراد کسی غیر یقینی حالت، ناموافق صورتِ حال، حرکت یا عمل کو ناکام بنانا ہے۔

مزاحمت دراصل کسی خیال، کسی تصور یا کسی فیصلے کی مخالفت کا عمل ہے۔ اس مخالفت میں اس فیصلے کو ہونے سے روکنے کی کوشش بھی شامل ہے۔ ۔ مزاحمت حقیقت میں مجروح جذبات ناانصافیوں کے زیرِ اثر ظہور پذیر ردِ عمل کا نام ہے۔ گویا مزاحمت ایک مضبوط اختلاف کا اظہار ہے۔

کہا جاتا ہے "ہر دور کا ادب اپنے زمانے کا عکس ہوا کرتا ہے"۔ اگر اس بات سے اتفاق کر لیا جائے تو اردو ادب کی باقی اصناف کی نسبت اردو شاعری میں یہ صورتِ حال زیادہ واضح نظر آتی ہے۔ کیونکہ اردو شاعری میں اتنی گنجائش ضرور ہے کہ اپنے زمانے کے تمام تر سیاسی، سماجی صورتِ حال و واقعات کو اپنے اندر تمام تر تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ سمیٹ سکتی

ہے۔ اردو شاعری کی اس خصوصیت کے بنا پر کسی دور یا زمانے کے سماجی رویوں، طور طریقوں اور حالات و واقعات کو اس دور میں لکھی گئی شاعری کے دامن میں تلاشا جا سکتا ہے۔

گلگت بلتستان کے اردو شعرا ء نے بھی سیاسی و سماجی رویوں اور معاشرتی ناانصافیوں کے خلاف ردِ عمل کا اظہار اپنے اشعار کے وسیلے سے کیا ہے۔ مجوزہ تحقیق میں گلگت بلتستان کی اردو شاعری میں مزاحمت کے سیاسی و سماجی زاویوں کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

مجوزہ تحقیقی موضوع کے تحت گلگت اور بلتستان سے منتخب اردو شعراء کی شاعری میں مزاحمت کے سیاسی و سماجی زاویوں کی نشاندہی کر کے نتیجہ اخذ کیا جائے گا۔

ii. بیانِ مسئلہ

اولاً گلگت بلتستان کے اردو ادب خصوصا شاعری کا مطالعہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ البتہ جو تحقیقات اس حوالے سے سامنے آئی ہیں۔ ان میں یہاں کی اردو شاعری کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ یہاں کی شاعری کا مطالعہ نئے تناظرات کے تحت کیا جائے۔ تاکہ اس خطے کے ادب کے ذریعے یہاں کے فکری و علمی رویوں کی بہتر تفہیم ممکن ہو سکے۔

iii. مقاصدِ تحقیق

۱۔ مزاحمت کا تعارف، اردو شاعری میں مزاحمتی فکر کا مختصر جائزہ لینا۔

۲۔ گلگت بلتستان کی اردو شاعری میں مزاحمت کے سیاسی و سماجی زاویوں کا مطالعہ کرنا۔

۳۔ گلگت اور بلتستان کی اردو شاعری میں مزاحمت کے سیاسی و سماجی زاویوں کا تقابلی جائزہ لینا۔

iv. تحقیقی سوالات

۱۔ مزاحمتی فکر کے خط و خال کیا ہیں؟

۲۔ گلگت بلتستان کی اردو شاعری میں سیاسی و سماجی سطح پر مزاحمتی فکر کے کم و کیف کیا ہیں؟

۳۔ گلگت بلتستان کے اردو شعراء کی شاعری میں سیاسی و سماجی سطح پر مزاحمتی فکر کے تناظر میں اشتراکات و افتراقات کیا ہیں؟

v. نظری دائرہ کار

مزاحمتی عناصر ادب اور ادبی مطالعات میں ہمیشہ مقدم رہتے ہیں۔ ہر شاعر و ادیب نے اپنے دور کی مناسبت سے ایسے موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ جن سے ان کا فکری و فنی اختلاف موجود تھا۔ اردو ادب کی روایت پر سرسری نظر ڈالنے سے اس کی توثیق ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد نے مزاحمتی ادب پر اپنی مرتبہ کتاب "مزاحمتی ادب اردو" کے مقدمے میں مزاحمت پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر طارق کلیم نے اپنی کتاب "اردو کی ظریفانہ شاعری میں مزاحمتی عناصر" میں مزاحمتی رویوں پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ مجوزہ تحقیقی موضوع پر اسی نظری دائرہ کار کے تحت گلگت بلتستان کی اردو شاعری میں مزاحمت کے سیاسی و سماجی زاویوں کا مطالعہ کیا جائے گا۔

تقابلی ادب کے حوالے سے سوزن بیسنٹ (Susan Bassnett) کی کتاب (comparative literature: A Critical Introduction) ایک مستند حوالہ ہے۔ جس کا ترجمہ توحید احمد صاحب نے "تقابلی ادب ایک تنقیدی جائزہ" کے

نام سے کیا ہے۔ گلگت بلتستان کے اردو شعراء کے ہاں سیاسی و سماجی سطح پر پائے جانے والے مزاحمتی زاویوں کا تقابل انہی نظریات کی روشنی میں کیا جائے گا۔

vi. تحقیقی طریقہ کار

مجوزہ تحقیقی مقالے کی تکمیل کے لیے گلگت بلتستان کے منتخب اردو شعراء کی شاعری میں مزاحمت کے سیاسی و سماجی زاویوں کا مطالعہ اور مزاحمتی سطح پر پائے جانے والے اشتراکات و افتراقات کے تجزیے کے لیے استقرائی اور استخراجی طریقہ کار اپنایا جائے گا۔

مجوزہ موضوع کے عمومی مباحث کے لیے ثانوی مآخذات سے بھرپور استفادے کی کوشش کی جائے گی۔ بنیادی و ثانوی مآخذات کے علاوہ مزید کتب کے جامعاتی، سرکاری و نجی کتب خانوں کے علاوہ آن لائن ادبی مواد سے بھی حسب ضرورت استفادہ کیا جائے گا۔

vii. مجوزہ موضوع پر ماقبلِ تحقیق

مجوزہ موضوع پر پاکستان میں جامعاتی سطح پر فی الحال کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ البتہ پی ایچ ڈی سطح پر ایک مقالہ بعنوان "شمالی علاقہ جات میں اردو زبان و ادب" ڈاکٹر عظمیٰ سلیم نے مکمل کیا ہے۔ جو اب کتابی صورت میں دستیاب ہے۔ اس مقالے میں ڈاکٹر عظمیٰ سلیم نے ۱۹۴۷ء سے لے کر ۲۰۰۲ء تک گلگت بلتستان کے اردو ادب کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ لیکن ۲۰۰۲ء کے بعد کا اردو ادب اس مقالے میں شامل نہیں۔ اسی طرح نمل یونیورسٹی سے ایم فل سطح پر ایک مقالہ

بعنوان "گلگت بلتستان میں اردو شاعری: تجزیاتی مطالعہ" مقالہ نگار عابد حسین نے مکمل کیا ہے۔ اس مقالے میں گلگت بلتستان کی اردو شاعری کے آغاز وارتقاء کے حوالے سے جائزہ لینے کے لیے مقالہ نگار نے گلگت بلتستان کی اردو شاعری کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور ۱۹۴۷ سے لے کر ۱۹۸۰ تک، دوسرا دور ۱۹۸۰ سے لے کر ۱۹۹۰ تک، تیسرا دور ۱۹۹۰ سے ۲۰۰۰ تک جب کہ چوتھا دور ۲۰۰۰ سے لے کر ۲۰۱۳ تک محیط ہے۔ اسی طرح حلقہ ارباب ذوق گلگت کی مرتبہ کتاب "گلگت بلتستان میں اردو ادب" حصہ نثر اور حصہ شاعری مطبوعہ صورت میں دستیاب ہے۔ اس کتاب کا حصہ نثر متفرق مضامین جب کہ حصہ نظم گلگت بلتستان کے اردو شعراء کے کلام کا انتخاب ہے۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری کی کتاب "مختصر تاریخ زبان وادب گلگت بلتستان" مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد نے شائع کی ہے۔ اس کتاب میں گلگت بلتستان کے مقامی زبان وادب کی تاریخ کو اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ درجہ بالا تمام کتب میں شامل مواد گلگت بلتستان کے ادب کا اجمالی جائزہ، شعراء کے تعارف اور مضامین تک محدود ہیں۔ لیکن ابھی تک گلگت بلتستان کی اردو شاعری کے حوالے سے کوئی فکری، فنی اور تنقیدی کام نہیں ہوا ہے۔ لہذا مجوزہ موضوع گلگت بلتستان کی اردو شاعری کی حقیقی صورت حال کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ علاوہ ازیں مجوزہ موضوع پر تحقیق سے گلگت بلتستان کے ادبآء ودانشوروں کے فکری میلانات کی وضاحت بھی ممکن ہو گی۔ اس طور گلگت بلتستان کی عوام کا مجموعی شعور بھی واضح ہو گا۔

viii. تحدید

مجوزہ تحقیق "مزاحمتی رویے اور شاعری: گلگت بلتستان کی اردو شاعری میں مزاحمت کے سیاسی وسماجی زاویوں کا مطالعہ" پر مشتمل ہے۔ مجوزہ موضوع پر تحقیق کے لیے گلگت اور بلتستان کے علمی اور ادبی حلقوں میں شہرت رکھنے والے شعراء کا انتخاب کیا جائے گا۔ اور منتخب شعراء کے کلام کو ان کے شعری مجموعوں سے اخذ کیا جائے گا۔ جن منتخب شعراء کے شعری مجموعے تاحال شائع نہیں ہوئے ہیں، ان کے نمونہ کلام تک رسائی کے لیے رسائل وجرائد اور دیگر دستیاب مآخذات تک رسائی حاصل کی جائے گی۔ اس کے علاوہ ان منتخب شعراء کی دیگر تحاریر، مثلاً کہانیاں، مضامین، سفر نامے، اخباری کالم وغیرہ مقالے کی تحقیقی حدود میں شامل نہیں ہوں گے۔

ix. پس منظری مطالعہ

مجوزہ تحقیقی موضوع سے قبل گلگت بلتستان کی اردو شاعری پر مندرجہ ذیل سندی مقالے لکھے جا چکے ہیں:

شمالی علاقہ جات میں اردو زبان و ادب کے عنوان سے ڈاکٹر عظمیٰ سلیم نے اپنی پی ایچ ڈی اردو کا مقالہ ۲۰۰۲ء میں مکمل کیا۔ اس مقالے میں شمالی علاقہ جات میں ۱۹۴۷ سے ۲۰۰۲ تک کے زبان و ادب کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے

گلگت بلتستان میں اردو شاعری: تجزیاتی مطالعہ کے عنوان سے عابد حسین نے ایم۔فل کا مقالہ ۲۰۱۶ ء میں مکمل کیا۔ اس مقالے میں گلگت بلتستان کی اردو شاعری کو چار ادوار میں تقسیم کر کے تجزیہ کیا گیا ہے۔ جو ۱۹۴۷ سے لے کر ۲۰۱۳ تک محیط ہے۔ لیکن ۲۰۱۳ء کے بعد منظر عام پر آنے والے شعراء اس مقالے میں شامل نہیں۔

جبکہ اسی حوالے سے مندرجہ ذیل تحقیقی کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں:

محمد حسن حسرتؔ کی کتاب تاریخِ ادبیاتِ بلتستان کے عنوان سے ۱۹۹۲ ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں بلتستان کے مقامی ادب کی تاریخ، بلتی شعراء کا تعارف، نمونہ کلام اور آخر میں چند اردو شعراء کا تعارف اور ان کے نمونہ کلام شامل ہیں۔ ۱۹۹۲ء کے بعد منظر عام پر آنے والے اردو شعراء کا تعارف اور نمونہ کلام اس کتاب میں شامل نہیں۔ اسی طرح شیر باز علی خان برچہ نے ایک کتاب تذکرہ اہلِ قلم و شعرائے گلگت کے عنوان سے ۱۹۹۸ ء میں شائع کی۔ یہ کتاب گلگت کے اہلِ قلم اور صرف سینئر شعراء کے تعارف پر مشتمل ہے۔ مختصر تاریخِ زبان و ادب گلگت بلتستان کے عنوان سے ڈاکٹر ممتاز منگلوری کی کتاب مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد سے ۲۰۰۵ ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے گلگت بلتستان کے مقامی زبان و ادب اور تاریخ کا اختصار سے جائزہ پیش کیا ہے۔

درج بالا تمام تحقیقی مقالے اور کتابیں صرف گلگت بلتستان کے شعراء کا تعارف اور زبان و ادب کے اجمالی جائزے تک محدود ہیں۔ لیکن گلگت بلتستان کی اردو شاعری میں مزاحمت کے سیاسی و سماجی زاویوں کے حوالے سے ابھی تک کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔اس حوالے سے یہ تحقیق ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔

x. تحقیق کی اہمیت

گلگت بلتستان کے اردو شعراء کی مادری زبان اردو نہ ہونے اور ادبی مراکز سے دور ہونے کے باوجود شروع دن سے اردو زبان سے والہانہ محبت کا اظہار کرتے چلے آرہے ہیں۔ جس کا ثبوت ان کی اردو تحاریر اور تصانیف ہیں۔

اس مقالے کے ذریعے گلگت بلتستان کے اردو شعراء کے کلام کا جائزہ لے کر ان منتخب شعراء کے ہاں سیاسی و سماجی سطح پر پائے جانے والے مزاحمتی فکر کا تقابل کر کے نتیجہ اخذ کیا جائے گا۔ جس سے ان منتخب شعراء کی شاعری میں مزاحمتی سطح پر پائے جانے والے اشتراکات و افتراقات کے علاوہ ان کی علمی و ادبی حیثیت کا تعین بھی ممکن ہو گا۔

اس تحقیق کے ذریعے گلگت بلتستان کی اردو شاعری پر مختلف اور نئے موضوعات کے حوالے سے تحقیقی باب وا ہوں گے۔

ب۔ بنیادی مباحث

انسان سماج میں کھل کر سانس لینا چاہتا ہے۔ وہ اس دنیا کو ایک پر سکون گھر کی طرح اور آرام دہ مسکن کے طور پر دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی دو دن کی زندگی کو آزادی سے بسر کرنا چاہتا ہے۔ لیکن یہ آزادی اسے کہاں نصیب؟

انسانی تاریخ گواہ ہے۔ کہ انسان کی اس بنیادی آزادی کو چھیننے والی طاقتوں اور آزادی کے حصول کی جہدِ مسلسل میں مصروفِ عمل لوگوں کی باہمی کشمکش سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے

سے معلوم ہوتا ہے کہ جبر و استحصال کی بے شمار قوتیں ہیں۔عالمی سطح پر طاقت ور اور مضبوط اقوام ،کمزور قوموں پر اپنا تسلط جمائے رکھتی ہیں۔ دنیا کے ہر سماج میں طاقت ور اور بالا دست طبقہ کبھی سیاست کے نام پر، کبھی ریاست کے نام پر، کبھی مذہب کے نام پر اور کبھی معیشت کے نام پر عوام کا استحصال کرتے چلے آرہے ہیں۔سماج میں ان استحصالی اور طاغوتی طاقتوں کے خلاف مزاحمتی عمل بھی جاری وساری ہے۔

انسانی آزادی کی یہ بنیادی خواہش

تیسری دنیا کے ممالک میں ایک خواب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ایک ایسا خواب جو کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو۔تیسری دنیا ایک پسماندہ اور مظلوم دنیا ہے۔ جہاں غربت، جہالت، سیاسی کشمکش اور تضادات، سماجی شکست و ریخت، بھوک ،افلاس، تعصبات، توہمات اور سماجی عدم استحکام اور اسی نوعیت کے بے شمار عوامل نے اس دنیا کے عوام کو جبر کی قوتوں کا نوالہ بنا رکھا ہے۔کائنات وجود میں آنے کے بعد انسانی عقل وشعور نے جب سے آگاہی حاصل کی تب سے مزاحمت کا ظہور وجود میں آئی۔

سماج میں جب جب طاقتوروں نے مظلوموں پر ظلم وستم روا رکھا، جہاں جہاں جور وجفا اور ظلم وبربریت کی آندھیاں چلیں، روح انسانیت کو زخمی کر کے جہاں جہاں دل کے نازک آبگینوں کو ٹھیس پہنچائی، وہاں وہاں لوگوں نے مزاحمت کی۔

کسی بھی باشعور اور سماج دوست انسان کے نزدیک

ظلم وستم کو برداشت کرنا کارِ ستم میں شریک ہونے کے مترادف ہے۔ ہر وہ باشعور انسان جو اپنے حقوق کو پہچانتا ہو وہ ان حقوق کی استحصالی اور پامالی پر مزاحمت ضرور کرتا ہے۔

کبھی کبھی یہ

مزاحمت انفرادی ہوتے ہوئے بھی اجتماعی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ اور اس کی لپیٹ میں پورا سماج آجاتا ہے۔ دنیا کے کسی نہ کسی کونے میں جبر و استبداد کے شعلے بلند ہوتے رہے ہیں۔ان طاغوتی طاقتوں اوران کے ظلم وستم کے خلاف فنکاروں، دانشوروں ،شاعروں اور ادیبوں نے اپنے قلم کے وسیلے سے ہمیشہ آواز حق بلند کرتے رہے۔یوں ان ادیبوں اور شاعروں کے قلم نے تلوار کا کام کر دکھایا اور مزاحمتی ادب کی داغ بیل پڑ گئی۔

رفتہ رفتہ

ان ادیبوں نے اپنے احساسات و جذبات کو قرطاس کی پیشانی پر نقش کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس طرح مزاحمتی ادب عالمی ادب میں مضبوطی سے اپنے قدم جمانے لگے۔ جس کا نتیجہ اس صورت میں منظر عام پر آیا کہ مزاحمت کا رواج ادبی تخلیقات میں عام ہوتا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل قلم کے ایک طبقہ فکر نے 'ادب برائے ادب' کا نظریہ ترک کر کے 'ادب برائے زندگی' کا نظریہ صرف اس لیے اپنایا کہ 'ادب برائے زندگی' کے نظریے کے ذریعے سماج کے سنجیدہ اور مشکل مسائل کی نشاندہی کر سکے۔ تاکہ پسے ہوئے پسماندہ طبقے کی مشکلات اور اذیتیں دنیا کے سامنے پیش ہوں۔ اور اپنی تخلیقات کے ذریعے ان کا حل پیش کیا جا سکے۔

بشریت کی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے تغیرات اور ہر بڑے انقلاب کے پس پردہ مزاحمت کو اہم مقام حاصل ہے۔ انقلاب و مزاحمت کی اس فضا کو ہر دور کے ادباء اور شعراء تیار کرتے چلے آئے ہیں۔ شعراء کی ان تخلیقی کاوشوں کی وجہ سے یہی مزاحمتی فکر عوام تک پہنچتے ہیں۔ جس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مزاحمت صرف ادب کی حد تک قید ہونے کی بجائے اس کی راہیں وسیع سے وسیع تر ہو جاتی ہیں۔ یوں جبر و استبداد کے خلاف آواز دنیا کے ہر زبان و ادب میں اٹھنے لگی۔ اس ضمن میں ادباء اور شعراء نے کئی تحریں لکھیں۔ پھر رفتہ رفتہ مزاحمت ادب کا ایک لازمی حصہ بن گیا۔

مزاحمت کی سیاسی و سماجی جہات پر بات کرنے سے پہلے ہم لفظ مزاحمت کی لغوی اور اصطلاحی مفہوم پر ذیل میں وضاحت کے ساتھ گفتگو کریں گے اور ادب میں مزاحمت کی اہمیت کو واضح کریں گے۔

I. مزاحمت کیا ہے؟

اوکسفرڈ اردو انگریزی لغت میں لفظ مزاحمت کو انگریزی زبان کے لفظ Resistance کے متبادل قرار دیا ہے۔(۱)

علمی اردو لغت میں لفظ مزاحمت کا معنی "روک، ممانعت، تعرض" بتایا گیا ہے۔(۲) شان الحق الحقی نے "فرہنگِ تلفظ" میں لفظ مزاحمت کا معنی "مخالفت یا رکاوٹ" لکھا ہے۔(۳)

اصطلاحِ ادب میں مزاحمت سے مراد سماج میں سیاسی، سماجی اور مذہبی عمل کے غیر منصفانہ اور غیر نامناسب سیاسی اور فطری رویوں کے خلاف ردِ عمل کا اظہار ہے۔ لفظ مزاحمت بنیادی طور پر عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کا معنی "رکاوٹ ڈالنا"، "رخنہ اندازی کرنا"، "خلل ڈالنا" وغیرہ مراد لیا جاتا ہے۔

روبینہ سہگل اس حوالے سے لکھتی ہیں:

"مزاحمت، ہر ایسے عمل سوچ رویے یا طریق کار کو کہا جاسکتا ہے جو کسی ناانصافی، ظلم، تشدد، بربریت یا جبر کے خلاف کیا گیا ہو۔ مزاحمت سے مراد ہے کسی چیز کو روکنا، کسی ظلم کی مخالفت کرنا، کسی ناانصافی کو برداشت کرنے سے انکار کرنا اور عملی اور متحرک انداز میں کسی ظلم کا سدِباب کرنا۔"(۴)

سبینہ اویس مزاحمت کی تعریف یوں لکھتی ہیں:

"مزاحمت عربی زبان کے لفظ 'زخم' سے مشتق ہے۔ جس کے لغوی معنی حریف سے ٹکرانے یا مدافعت کے ہیں۔ اصطلاحی معنی میں مزاحمت سے مراد وہ طرزِ عمل ہے۔ جو کسی صورتِ حال کو اپنانے سے انکار اور ناآسودگی کا اظہار ہے۔ ادب میں مزاحمت سے مراد یہ ہے اگر ادیب موجودہ صورتِ حال سے مطمئن نہ ہو، جبر و استحصال کے خلاف آواز بلند کرے تو عمومی معنوں میں ایسا ادب مزاحمتی ادب کے زمرے میں شامل ہو گا۔"(۵)

ہر تخلیق کار انسانی

ضمیر کا سب سے توانا محافظ ہے۔ اور یہی ضمیر شرف انسانیت کی واضح دلیل ہے۔ جبکہ غلامی چاہے جس صورت میں بھی ہو ، معاشی، سیاسی، ثقافتی اور فکری طور پر انسانیت کی تذلیل ہے۔ یہی بنیادی وجہ ہے کہ ہر باضمیر اور باشعور تخلیق کار فطرتاً آزاد ہوتا ہے اور جبر کی ہر صورت کے خلاف مزاحمت کرتا ہے۔ یوں مزاحمت اپنی جان، مال، عزت، آبرو، وطن اور نظریات کے دفاع میں کی گئی فکری اور عملی جدوجہد کا نام ہے۔ انسان کو سماج میں جبر کی بے شمار صورتوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ ان میں سے تین صورتیں زیادہ اہم ہیں۔(۶) پہلی صورت تو یہ ہے کہ کوئی بیرونی قوت حملہ آور ہو جائے۔ یہ حملہ وطن پر بھی ہو سکتا ہے اور فرد کی چار دیواری پر بھی۔ فرد کی چار دیواری پر حملہ ہونے کی صورت میں خطرہ صرف جان، مال اور عزت و آبرو کا ہوتا ہے۔ لیکن وطن پر حملہ ہونے کی صورت میں عزت و آبرو، جان و مال کے ساتھ سارا سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی نظام تتر بتر ہو جاتا ہے۔

جبر کی دوسری صورت یہ ہے کہ قوم خود کسی ریاستی جبر کا شکار ہو جائے۔ آمرانہ حکومتوں کے دور میں ریاستی جبر کے امکانات زیادہ واضح ہوتے ہیں۔ بادشاہی دور میں دنیا کا ہر خطہ جبر کا شکار تھا۔ کیونکہ اس نظام میں ملک بادشاہ کی ملکیت سمجھا جاتا ہے اور عوام کی حیثیت ایک شہری کی بجائے غلام اور رعایا کی ہوتی ہے۔ بادشاہی نظام لوگوں کی معاشی، سیاسی اور سماجی آزادی ہی سلب نہیں کرتا بلکہ فکری اور نفسیاتی طور پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ عرب ممالک جہاں بادشاہی نظام رائج ہیں ریاستی جبر کی سب سے بڑی مثال ہے۔ بعض اوقات فوجی آمریتیں بھی عوام کو ریاستی جبر کے ذریعے بنیادی انسانی حقوق سے محروم کر دیتی ہیں۔

جبر کی تیسری صورت یہ ہے
کہ خود سماج کے اندر سے ایک ایسی غیر مناسب صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے۔ جس سے معاشرے کا سیاسی و سماجی نظام کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ عام طور پر سماج میں اس قسم کے تبدیلیوں کے پیچھے کوئی خارجی طاقت موجود ہوتی ہے۔ انسان جس سماجی ماحول میں رہتا ہے وہ اس میں جینا سیکھ جاتا ہے۔ اس میں ہونے والی کوئی بھی تبدیلی اسے بے چین کر دیتی ہے۔ اور وہ اس تبدیلی کے خلاف جدوجہد کرتا ہے۔ اس طریقے سے مزاحمت بنیادی طور پر ایک عمل کا ردِ عمل ہوتا ہے۔

مزاحمت ایک دفاعی عمل کا نام ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں مزاحمت ایک ردِ عمل کا نام ہے۔ کوئی عمل ہو گا تو اس عمل کے خلاف ردِ عمل بھی ہو گی۔ مزاحمت اس وقت زیادہ نمایاں ہوتی ہے جب خارج یا داخل سے کوئی طاقت کسی معاشرے یا فرد پر اثر انداز ہو۔ سماج میں موجود مزاحمتی قوت اس وقت سامنے آئے گی جب کوئی طاقت اس کے سیاسی، سماجی یا معاشی نظام کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرے۔ فرد اور معاشرہ ہر وقت ارتقاء کی منزل طے کرتے رہتے ہیں۔ ان میں کچھ تبدیلیاں بھی رونما ہوتی رہتی ہیں۔ ان تبدیلیوں کو معاشرہ قبول بھی کر لیتا ہے اور کچھ کو غیر محسوس طریقے سے رد بھی کر دیتا ہے۔

مزاحمت انسان کی اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی شدید خواہش کا اظہار یہ ہے۔ وہ اپنی اجتماعی اور انفرادی زندگی میں کسی قسم کی مداخلت برداشت نہیں کرتا۔ اسے یہ قبول نہیں کہ اس کا حق دوسرا لے جائے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ "مزاحمت زندگی کی علامت ہے"۔(۷)

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے
معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہر دور میں ایک گروہ نے طاقت ور ہونے کی وجہ سے ظلم کو روا رکھا تو دوسرے گروہ نے ظلم سے بچاؤ کی ممکنہ کوششوں کو جاری رکھا۔ یہ تسلسل ازل سے ابد تک جاری رہے گا۔ ظلم و جبر کی بہت سی صورتیں ہیں۔ کسی پر جسمانی تشدد، مالی مفادات کو نقصان پہنچانا، فرد کی اجتماعی حقوق کی پامالی، کسی کے نظریات یا مذہب کی تضحیک یا کسی کے وطن یا مسند پر قبضہ سب ظلم اور ناانصافی ہے۔ اور اس ظلم و زیادتی سے بچاؤ کی جدوجہد دراصل مزاحمت ہے۔

وسیم کشفی لکھتے ہیں:

"جبری اور استحصالی معاشروں میں رائج اقدار اور نظام کے خلاف کسی کسی آواز کے تخلیقی سطح پر سامنے آنے کے امکانات ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ یقیناً یہ صورت حال قدیم ادوار سے تاحال اپنے فطری انداز میں رواں دواں ہے۔ زندگی کے ارتقائی سفر کو جبری قوتیں کبھی بھی مکمل طور پر روک نہیں سکیں۔ اور ارتقاء کے اس سفر میں مزاحمت، بغاوت اور انقلاب بنیادی کردار ادا کرتے چلے آرہے ہیں۔"(۸)

قوموں کی گزشتہ تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی تمام تحاریک مزاحمت سے شروع ہو کر بغاوت کے راستے سے ہوتی ہوئی انقلاب کی منزلوں پر پہنچ گئیں۔ سید سبط حسن مزاحمت، بغاوت اور انقلاب پر بحث کرتے ہوئے بغاوت اور انقلاب کے درمیان یوں خط کھینچتے ہیں:

"بغاوت نام ہے حکومت وقت یا مروجہ قوانین وضوابط عقائد واقدار سے علانیہ انحراف کا، بغاوت فکر و عمل کا منفی انداز ہے جو حال کے جبر سے نشو نما پاتا ہے۔ باغی کو اس سے سروکار نہیں ہوتا کہ جس تخریب کے وہ درپے ہے۔ اس کے ملبے پر کوئی بہتر عمارت کھڑی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ سماجی اور پیداواری رشتوں میں بنیادی تبدیلیاں لانے کا نام انقلاب ہے۔ معاشرتی انقلاب کی یہ وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر فکر و عمل کا منفی انداز مثبت صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور حال سے انکار ایک بہتر مستقبل کا مژدہ سناتا ہے۔ انقلاب تخریب بھی ہے اور تعمیر بھی"(۹)

تخریب اور تعمیر کی اس کشمکش میں مزاحمتی ادب کو فکری سطح پر جو اہمیت حاصل ہے۔ اس سے کسی طور انکار ممکن نہیں۔ اس کی سب سے بنیادی وجہ یہ ہے کہ قوموں کو ظلم و جبر کی تاریک راہوں سے نکال کر، جرات اور شعور اجاگر کر کے انقلاب کے راستے پر گامزن کرنے میں مزاحمتی ادب ہی کا کردار ہے۔

یہ امر مسلّم ہے کہ مزاحمتی ادب نے نہ صرف انسانی تہذیب و ثقافت کی بنیاد رکھی بلکہ اس کی زندگی کا خراج بھی ادا کیا۔ لہذا مزاحمتی ادب کا اطلاق استعمار کی گرفت میں جکڑے ہوئے یا استعماری طاقتوں کے دام میں گرفتار سماج کے باشعور فنکار کی ظلم و جبر کے خلاف آواز حق بلند کرنے اور آنے والے مستقبل کو بہتر بنانے کے خواب کا اعتبار کرنے کی تخلیقی کاوش پر ہوتا ہے۔ اس لیے جب جب بھی مزاحمتی ادب کی بات ہوتی ہے تو انسانی ذہن میں وہ تمام غیرت مند ادیب شاعر ابھرنے لگتے ہیں۔ جنھوں نے انسانی سماج میں انسانی زندگیوں کو بہتر بنانے کے لیے جبر و استبداد اور طاغوتی طاقتوں کے خلاف اہم کردار ادا کیا۔

II. مزاحمت سیاسی بحث

ادب زندگی کا عکس ہے۔ کہا جاتا ہے کہ "ہر زمانے کا ادب اپنے عہد کا آئنہ دار ہوتا ہے"۔ انسانی زندگی کی مختلف جہات ہیں۔ یہ مختلف جہات ادب کو اپنی اپنی حیثیت سے متاثر کرتی رہتی ہے۔ ادب اور سیاست کا رشتہ از منہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ سیاسی معاملات اور واقعات میں اتار و چڑھاؤ کسی بھی ادیب کو اس عنوان پر قلم اٹھانے کے تحریک کا کام دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے ادب میں سیاسی معاملات اور واقعات کی جھلک دکھانے سے ادب نہ صرف اپنے زمانے کی عکس بن جاتی ہے بلکہ ادب کو عصری شعور بھی عطا کرتی ہے۔ ادب کا زندگی سے براہ راست تعلق ہونے کی بنیاد پر ادب اور سیاست کا گہرا رشتہ بنتا ہے۔ اس سے بڑی بڑی ادبی تحریکیں، معاملات، انقلابات اور ادبی نظریات جڑے ہوئے ہیں۔ ادب ایک ایسا قوت اظہار ہے جس میں مزاحمت، احتجاج، انقلاب اور سیاست کی واضح جھلک موجود ہے۔ یوں آج ادب اقتصادی اور سیاسی حوالوں کے بغیر بے جان تصور کی جاتی ہے۔ کیونکہ ادب نام ہے زندگی کی عکس بینی کا۔ اور یہ مسلّمہ ہے آزادی اور خاص خاص ضرورتوں کا مہیا ہونا ضروری ہے تو پھر یہ کہنا کیا کہ ادب میں سیاسی امور یا اشارہ نہ ہو۔ سوچنا یہ ہے تو پھر کیا ادب بغیر ان باتوں کے ادب ہو بھی سکتا ہے؟ زندگی اقتصادیات سے وابستہ ہے اور اقتصادیات اور سیاست کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔(۱۰)

کوئی بھی ادیب اپنے گرد و پیش میں رونما ہونے والے سیاسی حالات و واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بعض اوقات تو ادب سیاسی مزاحمت اور انقلاب کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ ایسے صورت حال میں ادب سماج میں مزاحمت اور انقلاب کے لیے ذہن سازی کی وجہ بنتا ہے۔

جس طرح ادب کا تنقید کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔اسی طرح ادب کا سیاست کے ساتھ گہرا رشتہ ہے۔ تنقید جس طرح تخلیق سے قبل، تخلیق کے دوران اور تخلیق کے بعد بھی اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ اسی طرح ادب سیاسی و سماجی سطح پر مزاحمت اور انقلاب سے پہلے، مزاحمت اور انقلاب کے دوران اور بعد میں بھی اپنا اثر دکھاتا ہے۔یوں ادب سیاسی سطح پر تبدیلی کے آثار کو واضح کرکے ،دوران مزاحمت اس کی غرض و غائیت کو پیش کر کے اس کے بعد کے اثرات کو اجاگر کر کے اپنا کردار نبھاتا ہے۔

اردو کے ادباء اور شعراء نے اپنے اپنے فن پاروں کے وسیلے سے اپنے زمانے کے سیاسی صورتِ حال ا،اتار چڑھاؤ اور شکست وریخت کا پردہ چاک کیا ہے۔ سیاسی عناصر کا اصناف، ادوار اور شخصیات کے حوالے سے ادب اور شاعری میں در آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ سیاست زندگی اور سماج کی ایک اہم جہت ہونے کے ناطے ادب اور شاعری کا ایک اہم موضوع رہی ہے۔ ادب اور شاعری میں یہ صرف سیاسی اظہار کے حوالے سے ہی مشروط نہیں بلکہ ادب ،شاعری اور سیاست کا رشتہ تو آزادی کا پرچار بھی کرتا ہے۔ سیاست انسانی زندگی کی مختلف النوع جہات میں سے ایک ایسی جہت ہے جو کم از کم کچھ نہ ہو تو ادب اور شاعری کے لیے بھرپور توانائی ضرور رکھتی ہے۔ ادب اور شاعری جہاں سیاسی مزاحمت ،سیاسی انقلاب اور سیاسی آزادی کے لیے تڑپ پیدا کرتا ہے۔وہیں سیاسی حالات وواقعات کا رخ متعین کرنے میں بھی اپنا کردار ادا کرتا ہے۔

بابصیرت ادیب اپنی سمجھ بوجھ اور فہم کے مطابق سیاسی پسِ منظر کا جائزہ لے کر پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ سیاسی حالات وواقعات کو ادب میں جگہ دینے کے حامل ادیب،شاعر سیاسی سرگرمیوں اور زندگی کے خارجی حالات واقعات سے نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ سیاست کو دیکھتا ہے، سمجھتا ہے اور پرکھ کر اس کا اظہار اپنے ادبی انداز میں کرتا ہے۔

تاریخ گواہ ہے۔ معاشرے میں جب جب بھی تخلیق کاروں نے استحصالی نظام اور طاغوتی قوتوں کے خلاف آواز حق بلند کی ان کے ساتھ کیسا سلوک کیا گیا۔ وقتی طور پر ریاستی جبر کے ذریعے ان آوازوں کو دبانے کی کوشش بھی کی گئی۔ لیکن تاریخ ایسے کرداروں کو کبھی فراموش نہیں کرتی۔

سماج میں یا معاشرے میں کوئی بھی مزاحمتی تحریک تب ہی اٹھتی ہے۔جب ریاستی جبر اور استحصال برداشت سے باہر ہو جاتا ہے۔ وقتی طور پر اقتدار کو بچانے کے لیے ریاستی طور پر کوشش کی جاتی ہے کہ ایسے تمام آوازوں کو دبا دی جائے جو تبدیلی کا خواہاں ہو۔ لیکن قانونِ فطرت یہ ہوتا ہے کہ اس جمود کی کشمکش اور مبہود جبری فضا کو توڑنے کے لیے کوئی نہ کوئی

انقلابی ضرور پیدا ہوتا ہے۔ جو اپنے سماج کا تحفظ اور بقا کی خاطر اپنے جان پر کھیل کر سب کچھ بدلنے کے عزم سے لبریز ہوتا ہے۔ دھیرے دھیرے قومی حرکت میں جان آجاتی ہے اور پھر ایک منظم تحریک کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔

کسی بھی قوم میں سیاسی شعور اجاگر کرنے کے لیے اہلِ قلم کا کردار نہایت اہم ہوتا ہے۔ جو اپنے فن پاروں اور تخلیقات کے ذریعے تبدیلی کا کام کرتے ہیں۔ اسی لیے ادب کی مزاحمتی حیثیت بہت اہم ہوتی ہے۔ مزاحمت کسی نظام، فکر، نظریے اور رویے کو جبری طور پر قبول کرنے سے انکاری کا نام ہے۔ یہاں مزاحمت کرنے والے کی حیثیت مجبور اور محکوم کی سی ہے۔ جس کے خلاف مزاحمت کی جارہی ہو۔ وہ طاقت ور عنصر کے طور پر مزاحمت کرنے والے پر مسلط ہے۔

جب ہم سیاسی مزاحمتی جہت کی بات کرتے ہیں تو دراصل مزاحمت کار کا سیاسی مزاحمتی جدوجہد کا بنیادی مقصد وطن میں قانون و آئین کی بالادستی اور معاشرے میں عدل و انصاف کے ساتھ بنیادی حقوق کی فراہمی ہے۔ مزاحمت کار ملک دشمن عناصر، آئین و قانون سے بالا دست طبقے کے رویے، قانون شکن سیاسی شعبدہ بازوں کی منافقت اور غیر مناسب رویے کے خلاف کھل کر مزاحمت کرتا ہے۔

سیاسی مزاحمتی جدوجہد میں جبر و استبداد، آمریت، جمہور شکن رویوں، ملک دشمن عناصر، سیاسی عدم استحکام، غیر منصفانہ دولت کی تقسیم کے خلاف آواز اٹھانا بھی اسی جہت کا حصہ ہیں۔

III. مزاحمت سماجی بحث

ادب، سماج اور ادیب کی فکری صلاحیتوں میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ ادب چاہے جس صورت میں بھی ہو سماج کا پیداوار ہوتا ہے۔ اور ادب سماج کو متاثر کرتا ہے۔ راجندر ناتھ کا خیال ہے:

" تخلیقی ادیب سماجی حقائق سے تاثر لے کر ان تاثرات کو اپنے مخصوص ذہنی عمل سے تخلیقی رنگ بھر کر پیش کرتا ہے۔"(۱۱) یوں اس کا نقطہ آغاز زندگی اور سماج ہے اور منتہاء تخلیقِ ادب۔

اردو کے پہلے سیاسی و سماجی مزاحمت کار جعفر زٹلی سے لے کر جدید دور کے اردو شعراء تک اگر اردو شاعری کے سفر کا بغور جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کی شاعری اپنے دور کے سماجی شکست و ریخت کے عمل در رعمل پیغام اور بغاوت کی شاعری ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اسی حوالے سے لکھتے ہیں:

"اردو شاعری کسی بھی عہد میں اپنے گرد و پیش اور اس کے محرکات سے بے تعلق نہیں رہی۔ وجہ یہ ہے کہ شاعری آج کی ہو یا کل کی معاشرے کے بطن سے جنم لیتی ہے اور معاشرہ اپنے سیاسی و سماجی عوامل اور مواثرات کے تحت لمحہ لمحہ بدلتا رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہمارے پسند و ناپسند کا مزاج بدلتا رہتا ہے۔"(۱۲)

زندگی کا تحفظ ہر شخص چاہتا ہے۔ آزادی کی یہ لہر ہر شخص، ہر انسان اور آدمی میں یکساں موجزن ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے ادباء اور شعراء نے اپنے زمانے کے سماج میں رائج غلامی، افلاس، جہالت، سرمایہ داری اور اقتصادی ناانصافی کے خلاف مزاحمت اور بغاوت کرنے کے لیے ایک فعال کردار ادا کیا۔

ایک تخلیق کار معاشرے کا سب سے حساس ترین فرد ہوتا ہے۔ اس لیے وہ سماج کے متعلق اپنے احساسات اور تجربات کو ہو بہو لوگوں تک ویسے پہنچاتا ہے جیسے وہ سوچتا ہے۔ یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا شاعری میں سماجی مسائل کا احاطہ کرنے کی طاقت اور صلاحیت موجود ہے؟ اس کا جواب آصف حسین اپنے ایک مضمون میں یوں لکھتے ہیں:

"شاعری سماجی مسائل کو اجاگر کرنے میں معاون ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔ یہ سب کچھ شاعر کے مورال سسٹم پر منحصر ہے۔ اگر شاعر بے حس اور منافق ہو۔ اور سماجی مسائل کے حل کو صرف سیاست دانوں کی ذمہ داری سمجھتا ہو تو اس کی شاعری سماجی مسائل کا احاطہ کبھی بھی نہیں کرے گی۔ لیکن اگر شاعر کا ضمیر زندہ ہو اور شاعر کی طبیعت سماجی مسائل پر مضطرب اور بے چین رہتی ہے تو اس بات کے امکانات موجود ہیں کہ شاعر سماجی مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع ضرور بنائے گا"(۱۳)

انسانیت ہر شاعر کا بنیادی مسلک ہوتا ہے۔ اس لیے جب جب بھی انسانیت پر کاری ضرب پڑتا ہے۔ یا کسی طاقتور کے ہاتھوں کسی کمزور کا استحصال ہوتا ہے یا کسی کسان، مزدور کو فاقہ کشی کرنا پڑتا ہے یا سماجی میں کسی کی حق تلفی ہوتی ہے تو شاعر کا دل بے چین ہوتا ہے۔ لہذا وہ سماجی فرسودہ اور استحصالی نظام کو بدلنے کے لیے اپنے اشعار کو وسیلہ بنا کر رائے عامہ ہموار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دراصل یہی سماجی مزاحمت ہے۔

سماج میں انسانی حیات کی اجتماعی جدوجہد اور اس میں توفیق کے مطابق شرکت کا تقاضا ہی تو تھا کہ اردو شعراء نے سماج میں رائج استحصالی اور جبری رویوں اور طاقتوں کے خلاف جنگ میں بھرپور حصہ لیا۔ ان کی اس عمل کی وجہ سے وہ معاشرے میں معتوب بھی ٹھہرے۔ جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دینے کے باوجود اس سے بد دل ہونے کے بجائے پوری شد و مد کے ساتھ سماج دشمن پالیسیوں کی بھرپور مخالفت کرتے رہے۔

ابرار احمد مزاحمتی ادب کے باب میں یوں رقمطراز ہیں:

"ہر سماج میں بالا دست طبقہ عوام کا استحصال کرتے آرہے ہیں۔ ریاست کے نام پر مذہب کے نام پر، سیاست کے نام پر، معیشت کے نام پر۔ اور ان استحصالی قوتوں کا ہاتھ جھٹک دینے کے لیے مزاحمتی عمل بھی جاری وساری ہے "(۱۴)

ایک مزاحمت کار ادیب یا شاعر سماج میں موجود ان مذہبی شدت پسندوں کے خلاف بھی اعلان بغاوت کرتا ہے۔ جو اپنے مفادات کی خاطر اسلامی قوانین سے نہ صرف انحراف کرتا ہے۔ بلکہ شعائر اسلامی کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں۔ یا یوں کہیں کہ مذہب کو بنیاد بنا کر لوگوں کے جذبات سے کھیلتے ہیں۔ مزاحمت کار جب ان مذہبی ٹھیکہ داروں کے قول و فعل سے آشنا ہوتا ہے تو ان کے قول و فعل میں تضاد پا کر اپنے قلم کے وسیلے سے اعلان جہاد کرتا ہے۔ لہذا جب ہم سماجی مزاحمت کی بات کرتے ہیں تو سماج میں رائج انسانی رویے، استحصالی نظام، فرسودہ روایات، عدالتی رویے، قانون شکنی، مذہبی شدت پسندی، بھوک، غربت افلاس، ظلم وزیادتی اور ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرنا سماجی مزاحمت کے زمرے میں آتا ہے۔

کسی بھی معاشرے میں موجود مزاحمتی قوت اس وقت سامنے آجاتی ہے۔ جب کوئی اندرونی یا بیرونی طاقت اس کے سیاسی وسماجی نظام یا معاشی نظام کو اتھل پتھل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ماضی بعید میں مزاحمت یا دفاع کی دو ہی ممکنہ صورتیں تھیں۔ ایک تو تلوار کے ذریعے اپنا دفاع کرنا اور دوسرا فرار کا راستہ اختیار کرنا۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا استحصال کے طریقے بھی پیچیدہ ہوتے گئے۔ اور ساتھ ہی مزاحمت کے رویوں میں بھی تنوع آگیا۔ مثلاً موجودہ دور میں سیاسی جماعتوں اور ٹریڈ یونینز کا قیام بھی مزاحمت کا ایک طریقہ ہے۔ دور جدید میں اپوزیشن جماعتیں بھی ایک معتدل مزاحمت کرتی ہیں۔ جنگ وجدال کے ساتھ اب مزاحمت کے بہت سارے طریقے متعارف ہوگئے ہیں۔ اب تقریر، تحریر اور جلسے جلوسوں کے ذریعے بھی مزاحمت کیا جاتا ہے۔

جب کوئی معاشرہ استحصال کا نشانہ بنتا ہے تو اس کا ہر رکن مزاحمتی رویہ اختیار کرتا ہے۔(۱۵) ادیب کسی بھی معاشرے کا حساس طبقہ ہونے کے ناطے کسی ظلم یا جبر اور ناانصافی کو قبول کرنے میں معاشرے کے دیگر افراد کی نسبت زیادہ ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اور اپنے قلم کے ذریعے مزاحمت کا فریضہ انجام دیتا ہے۔

مزاحمت سماجی رسم ورواج، طے شدہ رویوں اور معاشرے میں رائج اقدار کے خلاف بھی ہوتی ہے۔ ایک تخلیق کار نہ صرف معاشرے کی نئے سرے سے تشکیل نو کرتا ہے بلکہ فرسودہ روایات اور بانجھ فکری تحریکوں کے خلاف بغاوت بھی کرتا ہے۔ اس طرح کے ادب کو بھی مزاحمت کہا جاتا ہے۔

مزاحمتی ادب کا ایک اور اہم رویہ اقداری، تاریخی اور سیاسی بیانیوں سے انکار کرنا بھی ہے۔ تخلیق کار انھیں قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ اور جو بیانیہ تخلیق کار بیان کرتا ہے دراصل یہی ریاست یا نظام کے متبادل بیانیہ کہا جا سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے مزاحمت کار سماجی سطح پر ہونے والی استحصال، ناانصافی، جبری رویوں، ظلم و زیادتی اور عدالتی رویوں کے خلاف کھل کر آواز حق بلند کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ حاکموں سے اظہارِ بیزاری، محکوموں اور محروموں کی حمایت اور سماج دشمن نظام اور پالیسیوں پر کڑی تنقید کرتا ہے۔ مزاحمت کار سماج میں انسانی بنیادی حقوق سلب کرنے والے سرمایہ دار طبقے کی مخالفت کرنے کے ساتھ غریب محکوم اور مظلوم لوگوں کو زیرِ عتاب رکھنے والے طبقوں کے خلاف تلخ لہجے میں گفتگو کرتے ہیں۔

حقیقت میں ادباء و شعراء کا سماج میں رائج جبر و استبداد، ظلم و زیادتی، ناانصافی، آمریت، استحصالی طاقتوں اور سماج دشمن نظام اور پالیسیوں کے خلاف آواز بلند کرنا سیاسی و سماجی مزاحمتی جہت میں شمار کیا جاتا ہے۔

IV. اردو شاعری میں مزاحمتی عناصر کا مختصر جائزہ

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے ساتھ ہی مسلمانوں کے زوال کا آغاز ہوا۔ کم و بیش پانچ سو سال سے قائم تہذیب کچی دیوار کی طرح مٹنا شروع ہوئی۔ مغلیہ سلطنت کو بے شمار خارجی اور داخلی مسائل نے جکڑ لیا۔ دلی کی مرکزی حکومت اپنی کم فہمی اور کم عقلی کی وجہ سے غیر ملکیوں کے چنگل میں پھنس چکی تھی۔ دلی والوں کے گلے میں غلامی کا طوق پہنانے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ فرنگی دانشمندی اور بصیرت سے کام لیتے ہوئے رفتہ رفتہ ملکی سیاست میں قدم جما رہے تھے۔ ہر طرف بغاوتوں، شورشوں، افراتفری اور انتشار کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ لوگوں کی عزت، آبرو، مال اور دولت محفوظ نہ تھیں۔ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ ایسے صورت حال میں سماج میں رہنے والے انسان عام طور پر دو طرح کے طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ وہ زندگی کی سخت اور تلخ حقائق سے راہ فرار اختیار کرتے ہیں۔ یا دوسری صورت یہ ہے کہ زندگی کی بحالی اور زندگی کو مثبت معنی دینے کے لیے از سرِ نو تعمیر کی کوشش کرتے ہیں۔ چونکہ اہلِ دلی کے ہاں تمام مادی وسائل ختم ہو چکی تھی۔ لہذا انہوں نے اول الذکر صورت حال یعنی تلخ حقائق سے راہ فرار اختیار کر لیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ زندگی ان کے لیے اک ایسی گزر گاہِ خیال بن گئی جس کی کوئی منزل ہی نہ ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شدید قسم کی فراریت اور داخلیت نے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔

شاعر ویسے بھی فطرتاً حساس طبیعت کا مالک ہوتا ہے۔ وہ اپنے اطراف میں رونما ہونے والے حالات و واقعات کا اثر عام لوگوں کی بہ نسبت گہرا اور جلدی قبول کر لیتا ہے۔ چنانچہ ہند کے مرکز دلی پر تباہی چھانے کے ساتھ دبستانِ دلی پر بھی قنوطیت اور مایوسی کے نہ ختم ہونے والے بادل چھا گئے۔

قنوطیت، مایوسی، افراتفری اور انتشار کی اس فضا میں ایک شوخ مزاج عجوبہ کردار سامنے دکھائی دیتا ہے۔ جسے لوگ جعفر زٹلی کے نام سے جانتے تھے۔ مزاحتمی اور سیاسی شاعری کے باب میں جعفر زٹلی پہلا نمائندہ شاعر تھا۔(۱۵) جس نے ایک مسخرے کا روپ دھار کر بادشاہ کی تنگ دستی پر طنز کے تیر چلائے۔ اور ہتک آمیز قہقہے لگانے سے بھی گریز نہیں کیا۔

جعفر زٹلی کے بعد آنے والے شعراء نے سیاسی، سماجی اور معاشی بدحالی کو شدت سے محسوس کیا۔ چنانچہ میرؔ اور دردؔ کی وارداتِ قلبی کی بات تو الگ رہی۔ سوداؔ جیسے بے فکرا اور خوش باش شاعر بھی اپنے گردوپیش کے حالات سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔

ایک زمانے میں تعمیر اور تہذیب کا پرتو کہلانے والی مغلیہ سلطنت اب تخریب اور تاراج کی سلطنت بن چکی تھی۔ انتظامی ڈھانچے کی بدحالی کی وجہ سے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی قدریں نیست و نابود ہو گیا تھا۔ ان تمام تر صورتِ حال میں میرؔ کے نوکِ قلم سے جو شعر تخلیق ہوئے وہ کھلی مزاحمت پر مشتمل ہے۔

لیاقت علی کے بقول: "شعرِ میر کی تفہیم کے لیے آہ اور اس کے مقابل واہ کا فارمولا تخلیق کیا گیا ہے۔ اگر کلامِ میر میں آہ ہے تو خالی آہ نہیں، آہِ زیست ہے اور یہی مزاحمت ہے"(۱۶)

میرؔ اور سوداؔ کے ہجویات نے اس دور کے سیاسی، سماجی اور معاشی صورتِ حال کو زیادہ واضح انداز میں پیش کیا۔ اُس دور کے ایک بڑے نظم گو شاعر نے اپنے زمانے کے اخلاقی اور فکری رویوں کا نقشہ اپنے اشعار کے ذریعے کھینچا۔ وہ بلاشبہ اردو کے عظیم شاعر نظیر اکبر آبادی ہے۔ انھیں اردو کا پہلا عوامی شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد یوں رقمطراز ہیں:

"نظیرؔ کی ساری شاعری اپنے عہد کے زوال کا مرثیہ ہے۔ چنانچہ نظیرؔ جس اخلاقیات اور بھائی چارے کا پرچار کرتے ہیں۔ وہ ان کے عہد کی ایک ضرورت بھی بنتی ہے اور اپنے عہد کی فکری و اخلاقی زبوں حالی کا نوحہ بھی۔"(۱۷)

سیاسی، سماجی اور معاشرتی سطح پر رونما ہونے والے زوال نے برصغیر کے لوگوں کی زندگی کو خاص طور سے متاثر کیا تھا۔ اس لیے عام آدمی کی سوچ اور فکر پر جو مایوسی کے سائے پڑے اس کا عکس اٹھارہویں صدی کی اردو شاعری میں واضح دکھائی

دیتاہے۔ اردو شاعری میں جعفر زٹلی سے لے کر مومن خان مومن تک کئی شعراء ایسے دکھائی دیتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے عہد کی سیاسی، سماجی، معاشرتی اور اخلاقی ناہمواریوں کو شدت سے محسوس کرکے اپنے اشعار میں برتنے کی شعوری کوشش کی۔ جس کا واضح ثبوت ان کی اردو شاعری ہے۔ لیکن اشرف علی خان، شاکر ناجی، شاہ حاتم، شاہ مبارک آبروؔ، مرزا رفیع سوداؔ، قائم چاند پوری، جعفر علی حسرتؔ، انشاءؔ، جرات، میر دردؔ اور میر تقی میرؔ کے ہاں شہر آشوب دکھائی دیتے ہیں۔ جو اس وقت کی صورت حال پر تاسف اور ترحم کا احساس دلاتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی خونین انقلاب برصغیر کی تاریخ میں ایک ایسا اہم موڑ ہے۔ جو اپنے دامن میں لاکھوں قیامتیں سمیٹے آئی۔ اس انقلاب سے ایک طرف مسلمانوں کا طویل دور ختم ہوا وہیں فرنگیوں کی غلامی کا طوق پورے ہندوستان کی گردن میں ڈال دیا گیا۔ اہلِ دلی اور لکھنو مصیبت کی حالت میں گرفتار تھے۔ لیکن علم و فن اور فکر کے سوتے کہاں خشک ہوتے ہیں؟ ان حالات میں جو مختلف سیاسی و سماجی تحریکیں ہندوستان میں وجود میں آئی۔ ان میں سرسید کی اصلاحی تحریک کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس تحریک کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے۔ کہ انتشار کے اس دور میں انفرادی سطح پر جن لوگوں میں کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں پیدا ہو رہی تھیں ان سب کو ایک مرکز پہ لانے کا کام کیا۔ الطاف حسین حالیؔ نے سرسید کی تحریک کے ساتھ مل کر جو اصلاحی کام کیے اس نے سماج کے ساتھ ادب پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ حالیؔ نے مدوجزر اسلام جیسی نظم تخلیق کرکے اردو شاعری کو نئی سمت و رفتار سے آشنا کیا۔ ڈاکٹر ابو للیث صدیقی لکھتے ہیں:

"حالیؔ کی مسدس اردو شاعری کی بلند آواز ہے۔ حالیؔ نے جو راستہ دکھایا تھا۔ اسی پر اکبرؔ، چکبسیت، اقبال اور جوشؔ سے لے کر فیضؔ تک گامزن ہوئے ہیں۔"(۱۸)

حالیؔ نے اپنی مقصدی شاعری کے ذریعے جن قومی اور انقلابی شاعری کو مضبوط بنیاد فراہم کیا تھا۔ اس پر آگے چل کر مولانا ظفر علی خان اور اقبال جیسے قد آور شعراء نے قوم کو بیدار کرنے کے لیے اپنی شاعری سے بھرپور استفادہ کیا۔ حالیؔ کے معاصرین میں محمد حسین آزادؔ کا نام بھی نمایاں ہے۔ آزاد جدید نظم کی بنیاد رکھنے والوں میں نمایاں ہے۔ مثنوی جیسی صنف کو آزاد نے خصوصیت سے داستان اور قصہ کہانی کی دنیا سے ہٹ کر قومی اور ملی شاعری کے لیے چنا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں قومی اور ملی شاعری کے حوالے سے ایک اہم نام شبلیؔ کا آتا ہے۔ جن کی وجہ شہرت تو نقاد اور مورخ کی حیثیت سے ہے۔ لیکن سیاسی سوجھ بوجھ کے حوالے سے حالیؔ اور سرسید پر بھی فوقیت لے گئے۔ سرسید اور حالیؔ کی

قرابت اور ہندؤں کی موجودہ سیاسی اور سماجی صورت حال نے شبلیؔ کے سیاسی اور قومی شاعری میں وہ سوز و اثر پیدا کر دیا۔ جس نے آئندہ چل کر اردو شاعری میں انقلابی اور مزاحمتی شاعری کے روشن رویے کو جنم دیا۔

انیسویں صدی کے اختتام پر سر سید اور ان کے مکتبہ فکر سے ہٹ کر ایک اور نام سامنے آتا ہے۔ وہ اکبر الہ آبادی کا نام ہے۔ اکبر الہ آبادی کے لیے کلیم الدین احمد کا یہ خوب صورت اور پر مغز جملہ: "اکبر کی شاعری ان کے عہد اور ان کے ماحول کا آئینہ ہے۔" (۱۹) واضح ثبوت ہے کہ اکبر اپنے ماحول سے صرفِ نظر کر کے نہیں رہے۔ اکبر مذہب، تہذیب اور روایات کا تحفظ چاہتے تھے۔ وہ اپنے ماضی سے رشتہ نہیں توڑنا چاہتے۔ لہذا اکبر الہ آبادی نے جن قومی اور ملی بیداری کی خواہش ظاہر کی تھی وہ عوام الناس میں تو نصف صدی کے بعد بھی نظر نہیں آئی۔ لیکن شعر و ادب میں اس کے اثرات واضح طور پر نمودار ہوئے۔

بیسویں صدی میں ایک شعر و ادب کی دنیا میں ایک اور نام ابھر کر سامنے آیا۔ وہ بلا شبہ علامہ اقبال کا تھا۔ اٹھارہویں صدی میں جعفر زٹلی سے شروع ہونے والی اردو کی مزاحمتی شاعری کا نقطہ آغاز ٹھیک دو سو سال بعد اقبال کے ہاتھوں انقلابی شاعری کے سانچے میں ڈھلنا شروع ہوئی۔

علامہ اقبال کو جبر و استبداد کا انجام بخوبی معلوم تھا۔ انہوں نے مغربی تہذیب اور فکر و عمل کا نہ صرف باریک بینی سے جائزہ لیا بلکہ اہلِ مغرب کے تہذیبی خرابیوں کو چُن چُن کر گنوائے۔ علامہ اقبال کی طبیعت میں مغرب کے خلاف مزاحمت اور احتجاج کی دو بنیادی وجوہات تھیں۔ ان وجوہات کے بارے میں ڈاکٹر سبینہ اویس یوں لکھتی ہیں:

"مغرب کی ظاہری ترقی آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔ لیکن اس میں حقیقی انسانیت کا جوہر ماند پڑ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے اقبال مغرب میں ہی ان کے دشمن بن گئے۔ اقبال کی طینت میں اہل مغرب کے خلاف غم و غصے کی دوسری وجہ اپنے ملک و ملت کی غلامی تھی۔ جس کی زد میں تمام عالمِ اسلام آ گیا تھا۔" (۲۰)

اقبال سیاسی اور معاشی جبر کے بھی خلاف تھے۔ ان کی شاہکار نظم "لینن خدا کے حضور" میں مزاحمت کی عمدہ مثال ہے۔ علامہ اقبال ہر اس نظام اور تہذیب کو جڑ سے اکھاڑ دینے کی تلقین کرتے ہیں جو استحصال اور جبر کو جنم دیتا ہو۔ انہوں نے سلطنت، تہذیب، کلیسا، قومیت اور نسل کو سرمایہ داری نظام کے بنائے ہوئے مسکرات کہا۔ جن کے ذریعے غریب اور مفلوج عوام کو مفلوج کر دیا۔ وہ نظم خضرِ راہ میں یوں گویا ہیں:

ساحر الموت نے تجھ کو دیا برگِ حشیش

اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ ثبات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کے بنائے مسکرات (۲۱)

اردو شاعری کا وہ انقلابی لہجہ جو ترقی پسند اور رومانی تحریک سے وابستہ تخلیق کاروں کا خاص وصف رہا اس کی ابتداء بھی علامہ اقبال کی شاعری سے ہوتی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اردو کی مزاحمتی شاعری جن جن عناصر سے مل کر تیار ہوئی وہ پہلی مرتبہ اقبال کی شاعری میں نظر آئے۔ سبینہ اویس نے انہی وجوہات کی بنیاد پر لکھا: "اردو کی مزاحمتی شاعری کی روایت میں اقبال کو مکمل مزاحمتی شاعر شمار کیا جاتا ہے۔"(۲۲)

اقبال کے معاصرین میں سے ایک اہم نام جوشؔ ملیح آبادی کا ہے۔ جو نہ صرف ظلم و ستم اور جبر و استبداد کے خلاف صف آرا ہونے کی ترغیب دیتے رہے بلکہ انسانی حقوق کے لیے آواز بھی بلند کرتے رہے۔ جوشؔ کی شاعری رومانیت اور انقلاب کا حسین امتزاج ہے۔ ان کی انقلابی شاعری کا زیادہ تر مرکز و محور انگریز سامراج دشمنی پر مبنی ہے۔ "شعلہ و شبنم"، "روحِ ادب"، "نقش و نگار" اور "آتش کدہ" کی بے شمار نظمیں واضح ثبوت ہیں۔ جوشؔ کے ہاں جذبہ آزادی، حریت فکر اور بغاوت کی لہریں زیادہ ہیں۔ جو عوام الناس کو آزادی کے لیے اکساتی ہیں۔ اپنی شاہکار نظم "شکستِ زنداں کا خواب" میں جوشؔ یوں گویا ہیں:

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شائد کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں (۲۳)

پاکستان میں مزاحمتی شاعری کی روایت کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تقسیم ہند کے پسِ منظر میں جو شاعری لکھی گئی ان میں یاس، حزن و ملال اور مزاحمتی رنگ زیادہ ہے۔ فیض احمد فیضؔ کا شمار بھی انہی شعراء میں ہوتا ہے۔ جن کے ہاں یہ رنگ تقسیم کے وقت سے گہرا نظر آتا ہے۔ فیضؔ کا خاصہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تخلیقات کی بنیاد ترقی پسند تحریک کے عطا کردہ سیاسی شعور پر رکھی۔ آزادی فکر، احترامِ آدمیت، آزادیِ اظہار، انسانی اقدار کی پاسداری اور بحالی فیضؔ کے نظریے کو

اپنے عہد کی توانا آواز بناتے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد جو سیاسی و سماجی صورت حال تھی۔ فیض احمد فیضؔ اپنے اشعار کے وسیلے سے بھرپور انداز میں اس کا پردہ چاک کرتے ہیں۔

اگرچہ فیضؔ کے شعری سرمایے میں بے شمار مزاحمتی نوعیت کی نظمیں ہیں۔ لیکن 'خوشا ضمانتِ غم،'متعین آواز'،'لوح و قلم'،'لہو کا سراغ'،'واسوخت'،'آج بازار میں پابجولاں چلو'،'شورشِ بربط پا'،'ادھر نہ دیکھو'،'یہ داغ داغ اجالا' ایسی نظمیں ہیں جن کو مزاحمتی ادب کی باب میں صفِ اول میں رکھا جاسکتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد جبر اور گھٹن کے مبہوت فضاء میں مارشلائی نظام کے خلاف زبردست مزاحمت کرنے والوں میں حبیب جالبؔ کا نام نمایاں ہے۔ حبیب جالبؔ کا دور وہ دور تھا جس میں خوں بستہ آنکھیں ظلم و جور کا نظارا تو کرتی تھیں مگر اس پر اشکِ خوں نہیں بہاسکتی تھیں۔ لوگ سرِ بازار نیلام ہو رہے تھے۔ جبر کی تاریک فضا میں حبیب جالبؔ نے ایک ایسی صدائے احتجاج بلند کی جس کی گونج سے ایوانِ اقتدار ہلنے لگی۔ اور وہ ہر آمر کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔ ایوب خان کا دور ہو یا ضیاء الحق کا زمانہ ہر دورِ آمریت میں حبیب جالبؔ نے حق تلفی اور ظلم و زیادتی کے خلاف آواز حق بلند کیا۔ حبیب جالبؔ نے ایوب خان کے دستورِ آئین کو یوں تضحیک کا نشانہ بنایا:

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسی دستور کو، صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا (۲۴)

جالبؔ کے معاصرین میں ایک اہم نام محسنؔ نقوی کا بھی ہے۔ انہوں نے بھی سیاسی و سماجی جبر کے خلاف نوکِ قلم سے زبردست صدائے احتجاج بلند کیا۔ ان کی تمام تخلیقات میں مزاحمتی رنگ غالب نظر آتا ہے۔

گزر رہی ہیں گلی سے پھر ماتمی ہوائیں
کواڑ کھولو، دیے بجھاؤ، اداس لوگو
جو رات مقتل میں بال کھولے اتر رہی تھی
وہ رات کیسی رہی، سناؤ اداس لوگو (۲۵)

اردو کے نابغہ روز گار شاعر احمد فرازؔ کا شمار بھی مزاحمتی شعراء کے قبیل میں ہوتا ہے۔انہوں نے آمریت، جبری نظام، ظلم و زیادتی، استحصالی طاقتوں اور مارشلائی نظام کے خلاف بھرپور احتجاج کیا۔اس پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں بھی براشت کی۔ لیکن اپنے نظریے سے پیچھے نہیں ہٹے۔اور جبر و استبداد کے خلاف مزاحمت کا علم تھامے رکھا۔ نظم 'بھول" سے چند اشعار ملاحظہ ہو:

افق پر دھندلکے، شفق میں الاؤ، گھٹاؤں میں شعلے، چمن میں ببول
بہاروں پہ صرصر کے گھمبیر سائے، نظاروں کے دامن میں نکہت بسائے
دلوں پر اداسی، دماغوں میں الجھن، خیالوں میں تلخی نگاہیں ملول
ہر اک سمت ویرانیوں کا نزول (۲۶)

احمد فرازؔ کے معاصرین میں شکیبؔ جلالی، احمد ندیمؔ قاسمی، منیرؔ نیازی ایسے شعراء ہیں جنہوں نے اپنے زمانے کے خارجی حالات کا نقشہ اپنے اشعار میں خوب کھینچا ہے۔ انہی شعراء کے بعد بے شمار شعراء و شاعرات ایسے ہیں جنہوں نے اپنی اپنی بساط کے مطابق سیاسی و سماجی جبر کے خلاف آواز بلند کرتے رہے۔ان میں پروین شاکر، فہمیدہ ریاض، افتخار عارف، ظفر اقبال، اصغر ندیم سید، عذرا عباس، محمد خالد اور مسعود منور کے نام شامل ہیں۔

V. گلگت بلتستان کا مختصر ادبی منظر نامہ

سلسلہ ہائے قراقرم، ہمالیہ اور ہندوکش کے درمیان تقریباً اٹھائیس ہزار مربع میل رقبے پر پھیلا ہوا خوب صورت خطہ، گلگت بلتستان کہلاتا ہے۔شروع میں یہ علاقہ شمالی علاقہ جات کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ۲۰۱۰ء میں پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت میں اس خطے کو ایک انتظامی صوبے کے طور پر پہچان دی گئی۔(۲۷) تب سے اس خطے کو گلگت بلتستان کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ ایک طویل عرصے تک یہ علاقہ ڈوگروں کے تسلط میں رہا۔ بعد ازاں قیام پاکستان کے ایک سال بعد ۱۹۴۸ء میں مقامی طور پر ڈوگروں سے آزادی حاصل کر کے پاکستان کے زیرِ انتظام چلا گیا۔ آزادی کے بعد یہ خطہ کچھ عرصہ صوبہ سرحد کے گورنر کے زیرِ انتظام رہا۔ پھر ۱۹۵۰ء میں اس علاقے کو براہ راست وفاق کے زیرِ انتظام لایا۔(۲۸)تب سے یہ علاقے وفاق کے زیرِ انتظام چلے آرہے ہیں۔

شمالی علاقہ جات کی قدیم تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو اس علاقے کی تاریخ دو الگ الگ حصوں "بلورستان" اور "دردستان" میں نظر آتی ہے۔(۲۹) ایک حصہ بلتستان سے تعلق رکھتا ہے۔جب کہ دوسرا حصہ گلگت ،ہنزہ نگر،غذر،دیامر وغیرہ سے متعلق ہیں۔ان علاقوں میں بولی جانے والی اہم زبانوں میں شینا،بلتی بروشسکی،وخی اور کھوار شامل ہیں۔

کسی بھی معاشرے میں ادب اس وقت فروغ پاتا ہے جہاں لوگ اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس نہ کریں ۔اپنی بات کہنے کی آزادی ہو،ریاست اور عوام کے درمیان کوئی رکاوٹیں نہ ہو۔گلگت بلتستان میں پہلی بار سیاسی ،سماجی اور معاشرتی سطح پر انقلابی تبدیلیوں پر روشنی ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی سب سے بڑی وجہ اردو تھی۔

گلگت بلتستان کے نامور محقق محمد حسن حسرتؔ ڈوگروں کی زبان کو بلتستان میں اردو کا سرخیل سمجھتے ہیں۔جبکہ شیر باز خان برچہ ۱۸۹۴/۱۸۹۳ء کے عوائل میں گلگت ریجن میں اردو زبان کی ترویج کے آثار کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر گلگت بلتستان میں اردو ادب کے آغاز وارتقاء کا اگر جائزہ لیا جائے ۔تو ڈاکٹر عظمیٰ سلیم کے مطابق ان علاقوں میں اردو زبان وادب پانچ مختلف ادوار سے گزرا۔(۳۰)

پہلا دور

۱۸۴۰ء سے لے کر ۱۹۲۵ء کے دورانیے پر محیط ہیں۔ جس میں اردو ارتقائی منازل طے کر کے خالص اردو زبان کی روپ میں سامنے آتی ہے۔ دوسرا دور کا دورانیہ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۸ء پر مشتمل ہے۔اس دور میں اردو کتابیں زیادہ تصنیف ہوئیں۔ جس میں زیادہ تر مذہبی کتابیں شامل ہیں۔ تیسرے دور کا آغاز آزادی سے لے کر ۱۹۵۱ء تک ہے۔اس دور میں گلگت بلتستان ڈوگروں کے تسلط سے آزاد ہوتے ہی ان علاقوں میں صحافت ،ڈراما اور دیگر ادبی اصناف پر طبع آزمائی ہونے لگی۔چوتھا دور ۱۹۸۱ء سے لے کر ۱۹۷۵ء تک ہے۔یہ وہ دور ہے جس میں مقامی قلم کاروں کا رابطہ ملک کے دیگر شہروں کے اہلِ قلم سے ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے گلگت بلتستان کے مقامی قلم کاروں نے اپنے فن کا لوہا ان علاقوں سے باہر بھی منوایا۔یہ وہ نقطہ آغاز ہے جس سے ان علاقوں میں اردو زبان وادب کو خاص طور پر فروغ ملا۔پانچویں دور کا دورانیہ ۱۹۷۵ء سے لے کر تا حال تک ہے۔اس دور میں اردو شاعری اور نثر کی مختلف اصناف پر طبع آزمائی کرنے کے ساتھ تحقیق ،تراجم ،صحافت وغیرہ میں مقامی قلم کاروں کا حصہ واضح طور پر نظر آتا ہے۔یہی وہ دور ہے جس میں ادبی تنظیموں کو فروغ ملا اور اردو ادب کی روز افزوں ترقی ہوئی۔

جب ڈوگروں نے پہلی بار ۱۸۴۰ء میں سرکاری زبان کے طور پر اردو کو نافذ کیا تو گویا گلگت بلتستان میں ایک انقلابی ثمرات سامنے آئی۔ جس نے آگے چل کر بڑے نامور ادیب اور شاعر پیدا کیے۔ ٹھیٹر کے آغاز نے لوگوں کو تفریح کا ماحول فراہم کرنے کا ساتھ علم و ادب کے منفرد ذائقے سے بھی آشنا کیا۔

مشاعروں کے آغاز نے

لوگوں کو شعور عطا کرنے کے ساتھ قوتِ گویائی بھی عطا کی۔ جب لوگوں کا شعوری رجحان بڑھا تو لوگوں کا رجحان صحافت کی طرف مبذول ہوئے۔ جس نے علمی، ادبی، سیاسی، سماجی اور تعلیمی شعور پیدا کرنے کے ساتھ اس سطح پر ہونے والی تبدیلیوں سے لوگوں کو آگاہ کیا۔

گلگت بلتستان

میں اردو ادب کو فروغ دینے میں اہم کردار یہاں کے مقامی ادبی تنظیموں اور ریڈیو سٹیشن کا بھی ہے۔ جس کے باعث ایک عام آدمی بھی اردو نظم و نثر سے آشنائی حاصل کرنے لگا۔ گلگت بلتستان میں اصنافِ ادب پر اگر بات کی جائے تو اردو شاعری میں نظم کی روایت قیام پاکستان سے قبل متعارف ہوئی۔(۳۱) یہاں پابند اور آزاد دونوں قسم کی نظمیں لکھی جاتی رہی ہیں۔ اس کے علاوہ نظم کے موضوعاتی اعتبار سے باقی اصناف میں مرثیہ، سلام، قطعات، رباعی، جیسے اصناف میں بھی یہاں کے شعراء طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔

گلگت بلتستان میں غزل کی صنف قیام پاکستان کے بہت دیر بعد متعارف ہوئی مگر گلگت بلتستان میں اردو غزل نے ارتقائی سفر بہت تیزی کے ساتھ طے کیا۔ جو آج بھی شد و مد کے ساتھ جاری ہے۔

گلگت بلتستان میں باقاعدہ طور پر مشاعروں کے انعقاد کا حوالہ ۱۹۶۰ء میں ملتا ہے۔ بعد ازاں یہی ادبی محافل اور مشاعروں نے اس خطے میں اردو زبان و ادب کی ترویج اور فروغ و اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ آج بھی گلگت بلتستان کے فعال ادبی تنظیمیں حلقہ اربابِ ذوق گلگت، ادبی انجمن فکری تحریک گلگت، انجمن ترقی پسند مصنفیں گلگت، قراقرم رائٹرز فورم، انجمنِ فکرِ سخن نگر، تنظیم اہلِ قلم دیامر، بزم علم و فن، بہار ادب، فکر سوشل فورم کی ذیلی شاخ فکرِ ادب اور مطلع ادب جیسے فعال تنظیمیں اسی روایت کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اگر گلگت بلتستان کی شاعری کا مجموعی موضوعاتی جائزہ لیا جائے تو یہاں کی شاعری میں داخلی کیفیات کا اظہار، مذہبی مضامین پر مشتمل شاعری، حب الوطنی کے جذبات سے لبریز

شاعری، مناظر فطرت پر مشتمل شاعری، جہادِ کشمیر، مفلسی، بھوک غربت، احساسِ محرومی، بے روزگاری، کشت وخون پر اظہار افسوس، دہشت گردی، بدامنی، جاگیرداری نظام سے اظہارِ بیزاری، جرائم پر اظہار ملامت، قوانین کے مسائل، طبقاتی کشمکش، اور بین الاقوامی سازشوں کے ملک پر اثرات کے نتیجے میں احتجاج نظر آتے ہیں۔

موجودہ دور میں اصنافِ

شاعری کے ذیل میں گلگت بلتستان کی اردو شاعری میں جدید اصناف کو بھی اظہار کا وسیلہ بنایا جارہا ہے۔ یہاں کے اردو شعراء کا کلام ملک کے مختلف ادبی رسائل وجرائد میں تسلسل کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ یہاں کے شعراء کسی طور بھی ملک کے دوسرے شہروں کے شعراء سے پیچھے نہیں۔

گلگت بلتستان کے اردو نثر کی بات جائے تو گلگت بلتستان میں افسانوی نثر کی ابتداء ڈرامے سے ہوئی۔ مگر بد قسمتی سے اردو ڈراما صرف ریڈیو تک محدود رہا۔ آج کے دور میں ڈراما لکھنے کا رجحان اولاً تو یہاں نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر ہے بھی تو صرف ریڈیو کے مختلف پروگرامات کے لیے لکھے جاتے ہیں۔

گلگت بلتستان میں اردو افسانہ ۱۹۵۸ء کے بعد بطور صنف متعارف ہوا۔ لیکن

گلگت بلتستان میں اردو افسانہ اپنے اولین ارتقائی سفر کے دوران نوئے کی دہائی تک تعطل کا شکار رہی۔ مگر اب اس صنف کو شاعری کی طرح زیادہ تقویت ملی ہے۔ اور نوجوان افسانہ نگاروں کی ایک کھیپ مختلف موضوعات پر افسانے لکھ رہے ہیں۔

گلگت بلتستان میں ناول نگاری کا رجحان ۱۹۹۰ء کے عوائل میں سامنے آتا ہے۔ مگر اس صنف کو اب تک خاص پذیرائی نہیں ملی۔

گلگت بلتستان کے

لوگ فطرتاً مہم جو ہوتے ہیں۔ اس لیے انھیں کوئی نہ کوئی سفر درپیش رہتا ہے۔ یوں اصنافِ نثر کی باقی اقسام کی طرح یہاں سفر نامہ نگاری کا رجحان بھی نمایاں ہیں۔ اگرچہ سفر نامہ نگاری بطور صنف یہاں باقی اصناف ادب کی بہ نسبت بہت دیر بعد متعارف ہوئی۔ مگر اردو افسانے کے بعد اس صنف کو خاص تقویت ملی۔ اب تو مردوں کے ساتھ خواتین سفر نامہ نگاروں نے اپنی سفری روداد کتاب کی صورت میں شائع کی ہے۔

اگر مجموعی طور پر موضوعاتی اعتبار سے یہاں

اصنافِ ادب کی بات کی جائے تو شاعری کی بہ نسبت نثر میں محدودیت نمایاں ہے۔ نثر میں یہاں کے ادباء اپنے علاقے سے باہر کے موضوعات کو اب تک قبول نہیں کر پائے۔ جبکہ شاعری میں لامحدودیت کے آثار واضح ہیں۔

ادب کا فروغ اسی معاشرے میں ہوتا

ہے جہاں مطمئن افراد کی تعداد زیادہ ہو۔ گلگت بلتستان میں زیادہ تر افراد معاشی تگ و دو میں مصروفِ عمل رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان علاقوں میں قتل و غارت گری اور فسادات نے عدم استحکام کے احساس کو بھی جنم دیا۔ جس کی وجہ سے افسانوی نثر کے ذیل میں یہاں کے ادباء اور اہلِ قلم نے کم ہی اصناف پر طبع آزمائی کی۔

گلگت بلتستان کا یہ علاقہ شروع ہی سے سیاسی

، سماجی، مذہبی، معاشی اور معاشرتی طور پر عدم استحکام کا شکار رہی۔ جس سے ادب کی تخلیق پر بھی واضح فرق پڑا۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہاں اردو ادب کی اصناف کو تبھی فروغ ملے گا۔ جب یہاں سیاسی، سماجی اور معاشی طور پر استحکام نظر آئے۔ جس کے نتیجے میں تعلیمی اور شعوری ترقی ممکن ہو گی۔ جو آگے چل کر ادب کی ترقی کا باعث بنے گا۔

حوالہ جات

۱۔ اوکسفرڈ اردو انگریزی لغت، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۳، ص ۱۰۰۲

۲۔ علمی اردو لغت، علمی کتاب خانہ لاہور، ۱۹۹۶، ص ۱۳۸۰

۳۔ فرہنگِ تلفظ، مرتبہ شان الحق الحقی، ادارہ فروغ قومی زبان اسلام اباد، ۲۰۱۷، ص ۶۳۸

۴۔ روبینہ سہگل، بحوالہ اردو کی ظریفانہ شاعری میں مزاحمتی عناصر، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۱۸، ص ۵۱

۵۔ سبینہ اویس، ڈاکٹر، فیض کی شاعری میں مزاحمتی عناصر، (مضمون) مطبوعہ: امتزاج 5 Issue 1,Vol، ۲۰۱۸، شعبہ اردو جامعہ کراچی، ص ۵

۶۔ کلیم طارق، ڈاکٹر، اردو کی ظریفانہ شاعری میں مزاحمتی عناصر، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۱۸، ص ۵۱

۷۔ ایضاً، ص ۵۲

۸۔ وسیم کشفی، اردو میں مزاحمتی اور انقلابی شاعری (مقالہ ایم۔فل)، قومی ادارہ برائے مطالعہ پاکستان قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد، ۱۹۹۴، ص ۵

۹۔ سبط حسن، سید، نویدِ فکر، مکتبہ دانیال کراچی، طبع ششم، ۱۹۹۰، ص ۲۲۲/۲۲۱

۱۰۔ اعجاز حسین، ادب اور سیاست، (مضمون) مشمولہ: ادب زندگی اور سیاست، مرتبہ محمد خاور نوازش، مثالی پبلی کیشنز فیصل آباد، ۲۰۱۲، ص، ۳۳۱

۱۱۔ شیدا، راجندر ناتھ، ادب فکر اور سماج، ہندوستان لیتھو پرنٹنگ پریس دہلی، ۱۹۷۲، ص ۷

۱۲۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، پاکستانی معاشرہ اور اردو شاعری، (مضمون) مشمولہ: پاکستانی معاشرہ اور ادب، مرتبین ڈاکٹر سید حسین محمد جعفری / احمد سلیم، پاکستان اسٹڈی سنٹر جامعہ کراچی، ۱۹۸۷، ص، ۱۹۷۶

۱۳۔ آصف جاوید، کیا شاعری سماجی مسائل کو اجاگر کرنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہے؟www.nayazamana.com، ۳۰مارچ ۲۰۲۱، 1:002 pm

۱۴۔ ابرار احمد، مزاحمتی ادب، (مضمون) مشمولہ: مزاحمتی ادب اردو، مرتبہ رشید امجد، مقتدرہ قومی زبان اردو، ۲۰۰۹، ص ۴۸

۱۵۔ طارق کلیم، ڈاکٹر، اردو کی ظریفانہ شاعری میں مزاحمتی عناصر، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۱۸، ص ۳۲۲

۱۶۔ لیاقت علی، محسن نقوی کی مزاحمتی شاعری، مقالہ (ایم فل اردو)، غیر مطبوعہ، جی سی یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۸، ص ۲۷

۱۷۔ رشید امجد، ڈاکٹر، نظم سے جدید نظم تک، (مضمون) مشمولہ: شاعری کی سیاسی و فکری روایت، دستاویز مطبوعات، لاہور، ۱۹۹۳، ص ۵۲۰

۱۸۔ ابواللیث صدیقی، تجربے اور روایت، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، س۔ن، ص ۵۳ / ۵۲

۱۹۔ کلیم الدین احمد، اردو شاعری پر ایک نظر، نئی شاعری، حصہ دوئم، نیشنل بک فاونڈیشن اسلام آباد، ۱۹۸۶، ص ۶۸

۲۰۔ سبینہ اویس، ڈاکٹر، اقبال کی شاعری میں مزاحمتی عناصر، (مضمون) مطبوعہ: امتزاج Issue 1,Vol 4، ۲۹ اگست ۲۰۱۹، شعبہ اردو جامعہ کراچی، ص ۳۲

۲۱۔ اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال، عثمان پبلی کیشنز ۲۰۰۰، ص ۳۶۷

۲۲۔ سبینہ اویس، ڈاکٹر، اقبال کی شاعری میں مزاحمتی عناصر، (مضمون) مطبوعہ: امتزاج Issue 1,Vol 4، ۲۹ اگست ۲۰۱۹، شعبہ اردو جامعہ کراچی، ص ۳۹

۲۳۔ فضل امام، (مرتب)، انتخاب کلیات جوشؔ پبلیشر ندارد، س۔ن، ص ۲۹

۲۴۔ حبیب جالبؔ، کلیاتِ حبیب جالبؔ، ماورا پبلیشرز، لاہور، ۱۹۹۳، ص ۱۹۹۳

۲۵۔ محسن نقوی، ریزہ حرف، ماورا پبلیشرز لاہور، ۲۰۱۲، ص ۹۹

۲۶۔ احمد فرازؔ، (کلیات) شہر سخن آراستہ ہے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۳، ص ۳۵

۲۷۔ عظمیٰ سلیم، ڈاکٹر، گلگت بلتستان کی زبانوں کا جائزہ، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۷، ص ۱۲

۲۸۔ نسیم، محمد قاسم، گلگت بلتستان اور مسئلہ کشمیر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷، ص، ۱۰۶

۲۹۔ ممتاز منگلوری، ڈاکٹر، مختصر تاریخِ زبان و ادب گلگت بلتستان، ادارہ فروغِ زبان اردو، اسلام آباد، ۲۰۱۹، ص ۲۷

۳۰۔ عظمیٰ سلیم، ڈاکٹر، شمالی علاقہ جات میں اردو ادب کا آغاز و ارتقاء، (مضمون) مشمولہ: اخبار اردو، شمارہ ۸، ۷، جلد ۱۹، جولائی تا اگست ۲۰۰۳، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ص ۳۰۸

۳۱۔ عظمیٰ سلیم، ڈاکٹر، شمالی علاقہ جات میں اردو ادب، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۸، ص ۳۰۸

باب دوم

گلگت کے منتخب اردو شعراء کی شاعری میں مزاحمت کے سیاسی و سماجی زاویوں کا مطالعہ

الف۔ گلگت کے اہم شعراء کا تعارف

عبدالخالق تاجؔ

عبدالخالق تاجؔ ۱۳ اپریل ۱۹۴۸ کو گلگت کے ایک گاؤں ہنزل پائین میں پیدا ہوئے۔(۱) گورنمنٹ پرائمری سکول جاگیر بسین سے پرائمری پاس کرنے کے بعد فیڈرل گورنمنٹ ہائی سکول گلگت سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس دور میں گلگت بلتستان میں کالج سطح کا کوئی تعلیمی ادارہ نہیں تھا۔ لہذا آپ نے تعلیمی سفر کو جاری رکھنے کے لیے شہر کراچی کا رخ کیا۔ وہاں اسلامیہ کالج کراچی سے ایف۔ اے پاس کرنے کے بعد واپس آکر گورنمنٹ مڈل سکول چلاس میں بطور مدرس پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا۔ اسی دوران پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ اور ۱۹۷۴ میں گلگت بلتستان (اس وقت کے شمالی علاقہ جات) انتظامیہ میں بحیثیت نائب تحصیلدار بھرتی ہوا۔ وہاں آپ مختلف انتظامی عہدوں پہ خدمات سرانجام دیتے رہے اور ۲۰۰۸ میں بحیثیت سٹی مجسٹریٹ گلگت اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

عبدالخالق تاجؔ کو زمانہ طالب

علمی سے علم و ادب سے دلچسپی تھا اس لیے ادبی فن پاروں کے مطالعے کے ساتھ نظم و نثر دونوں اصناف میں برابر طبع آزمائی کرتے رہے۔ آپ اردو اور شینا دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔

گلگت بلتستان کے علمی اور ادبی حلقوں

میں معتبر ادیب شمار ہونے کی وجہ سے سن ۱۹۸۸ سے لے کر اب تک حلقہ ارباب ذوق گلگت کے سینیر وائس چیر مین ہے۔ آپ قراقرم آرٹس کونسل اور گرانڈ کلچر سوسائٹی کا پندرہ سال تک چیر مین بھی رہے۔

عبدالخالق تاجؔ کا اب تک کوئی اردو شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ البتہ اردو شاعری کا مجموعہ کلام "تکلف بر طرف" زیر ترتیب ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی تحریر کردہ اولین شنا لغت ۱۹۸۹ میں منصہ شہود پر زیور طبع سے آراستہ ہو کر آئی۔ شنا زبان و ادب پر مشتمل کتاب اکادمی ادبیات نے چھاپی ہے۔ اس کے علاوہ ضخیم شنا لغت ابھی زیرِ طبع ہے۔ تاجؔ صاحب کا اصل میدان سخن غزل گوئی ہے۔ تاہم نظم اور قطعات بھی حالات حاضرہ کے مطابق لکھتے ہیں۔ ان کے شعری موضوعات میں سماجی شعور اور مزاحمتی رنگ زیادہ ہے۔

جمشید خان دکھیؔ

جمشید خان دکھیؔ ۵ جون ۱۹۵۶ء کو گلگت میں

پیدا ہوئے۔ آپ کے آباءواجداد تقریباً ڈیڑھ صدی پہلے تلاش روزگار کے سلسلے میں گلگت آئے تھے۔ والدین کا سایہ کم عمری میں اٹھ جانے کی وجہ سے باقاعدہ تعلیم تو حاصل نہیں کی البتہ مطالعے کے شوق کو مشکل حالات میں بھی زندہ رکھا۔ اور کراچی یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان بطور پرائیوٹ امیدوار پاس کیا۔

جمشید خان دکھیؔ نے سخن گوئی کا آغاز رومانی شاعری سے کیا۔ لیکن معاشرتی ناہمواریوں کی وجہ سے ان کی فکر کا دھارا

یکسر تبدیل ہو کر مزاحمتی رنگ اختیار کر گیا۔ اسی لیے گلگت بلتستان کے علمی و ادبی حلقوں میں آپ کو گلگت بلتستان کا "حبیب جالب" کہا جاتا ہے۔

جمشید دکھیؔ نثر اور شعر دونوں اصناف میں لکھتے ہیں۔ آپ اردو اور شینا دونوں زبانوں کے شاعر ہیں۔ جمشید دکھی سخن گوئی کے میدان میں نظم ،غزل اور قطعات تینوں اصناف میں لکھتے ہیں۔ تاہم آپ کا لہجہ مکمل طور پر مزاحتمی ہے۔ ابھی تک جمشید خان دکھیؔ کا کوئی اردو شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ البتہ اردو شعری کلام کا مجموعہ "تصویرِ درد" زیرِ طبع ہے۔ آپ کی نثری تصانیف میں انسائیکلوپیڈیا آف فوک لو (حصہ شنا) لوک ورثہ اسلام آباد نے ۲۰۰۵ء میں شائع کی۔ آپ کی تحقیقی کتاب "پروفیسر عثمان علی ایک نامور مورخ" ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی۔

اکادمی ادبیات اسلام آباد کے زیر اہتمام شائع کتاب، کتابیات پاکستانی ادب ۱۹۹۷ء کے کھوار کتابیات کے تمام حصے کا کام جمشید دکھیؔ نے کیا۔ آپ نے سورہ فاتحہ کا مفہوم قومی زبان اردو میں نظم کرنے کے علاوہ علامہ اقبال کے کئی اردو نظموں کا شینا زبان میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔

جمشید دکھیؔ نہ صرف شاعری بلکہ کالم نگاری کے ذریعے علاقے کے مخصوص حالات میں مذہبی منافرت اور نسلی تعصبات کے خاتمے، مذہبی ہم آہنگی اور قیام امن کے لیے مثالی کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ ان کی اس خدمات کے اعتراف میں روزنامہ کے ٹو گلگت بلتستان نے ۲۰۰۱ء میں کے۔ٹو ایوارڈ سے نوازا۔ جبکہ سماجی خدمات کے اعتراف میں پاکستان سوشل ویلفر ایسوی ایشن کی طرف سے قائد اعظم ایوارڈ سے بھی نوازا گیا ہے۔ آپ کے اردو شعری مجموعہ کلام کے علاوہ شینا شاعری پر مشتمل کتاب بھی زیر ترتیب ہیں۔

محمد امین ضیاء

محمد امین ضیاء

گلگت میں پیدا ہوئے۔ آپ گلگت کے پشتنی باشندے ہیں۔ امین ضیاء بیک وقت ادیب ،شاعر، نقاد ،خطاط، مصور، معلم، صحافی اور ریڈیو آرٹسٹ کے طور پر جانے جاتے ہیں۔گھریلو حالات ساز گار نہ ہونے کی وجہ سے آپ نے کسی تعلیمی ادارے سے باقاعدہ تعلیم تو حاصل نہیں کی البتہ ایم۔اے تک تعلیم پرائیوٹ امتحان دے کر پاس کیا۔

پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز بطور ریڈیو آرٹسٹ ریڈیو پاکستان کے شینا سکشن سے کیا۔ امین ضیاء گلگت بلتستان کی قدر آور ادبی شخصیت ہے۔ گزشتہ دو دہائیوں سے وہ حلقہ ارباب ذوق گلگت کے صدر ہیں۔ وہ شینا زبان کے ایک صاحب طرز شاعر، خوش اسلوب نثر نگار اور ایک نامور ماہر لسانیات ہیں۔ شینا زبان کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز بھی امین ضیاء صاحب کو حاصل ہے۔(۲)

امین ضیاء صاحب کا

محبوب میدان غزل ہے۔ مجموعی طور پر ان کے کلام میں رہبانیت ،رندی ،انسان دوستی ،مساوات،خود شناسی اور معاشرتی ناہمواریوں کے خلاف مزاحمتی افکار نمایاں ہیں۔

امین ضیاء کا پہلا شعری مجموعہ سان (شراب کی بھٹی) شینا زبان میں منظر عام پر آیا۔(۳) آپ کی شینا کہاوتوں پر مشتمل کتاب لوک ورثہ اسلام آباد نے ۱۹۷۸ میں شائع کی۔ شینا قاعدہ اور گرائمر بھی آپ کی تخلیق ہیں۔ ان کا اردو مجموعہ کلام "سروشِ ضیاء" ۲۰۱۰ء، میں منظر عام پر آئی۔ اس کے علاوہ شینا زبان کی ضخیم لغت بھی زیرِ ترتیب ہے۔

خوشی محمد طارقؔ

خوشی محمد طارق ۱۶ مئی ۵۳ ۱۹ء کو پشواڑی منی مرگ ضلع استور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے آباو اجداد

ترکستان سے کابل اور وہاں سے تقریبا تین سو سال پہلے گلگت بلتستان منتقل ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم علی محمد خان کی زیر نگرانی حاصل کی جو اس زمانے میں ایس۔پی کالج سری نگر کے گریجویٹ تھے۔ آپ نے مڈل سے لے کر میٹرک تک تعلیم گورنمنٹ پائیلٹ سکول گڑھی دوپٹہ آزاد کشمیر، انٹر گورنمنٹ کالج آزاد کشمیر اور گریجویشن اصغر مال کالج راولپنڈی سے پاس کیے۔ گریجویشن کے بعد ۱۹۷۴ء میں گلگت بلتستان پولیس میں بطور ڈی۔ایس۔پی بھرتے ہوئے۔ بعد ازاں ۱۹۷۷ء میں پولیس کی نوکری سے استعفی دے کر ۱۹۸۳ء میں ہونے والے گلگت بلتستان کونسل کے انتخابات میں حصہ لیا اور ضلع کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ خوشی محمد طارق کا اصل تعلق تو منی مرگ استور سے ہے۔ لیکن آپ نوے کی دہائی سے مسلسل گلگت شہر میں مقیم ہیں۔ گلگت منتقلی کے بعد آپ نے ریڈیو پاکستان گلگت سے بطور اردو نیوز ریڈر منسلک ہوا۔ کچھ عرصہ نیور ایڈٹنگ کے شعبے سے بھی منسلک رہا۔ علاوہ ازیں پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے رپورٹنگ بھی کی۔

خوشی محمد طارقؔ ایک صاحب اسلوب شاعر ہونے کے ساتھ بطور صحافی بھی علمی و ادبی حلقوں میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ ۱۹۹۰ء سے لے کر اب تک مختلف اخبارات کے لیے تسلسل کے ساتھ کالم بھی لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ جن میں سیاچن، ہمالیہ، کے۔ٹو، کشمیر، نوائے وقت، اساس اور مختلف رسائل شامل ہیں۔

خوشی محمد طارقؔ کو ادب سے دلچسپی زمانہ طالب علمی سے ہوا۔ اصغر مال کالج میں اردو سوسائٹی کا جنرل سکریٹری بھی رہا۔ اور مختلف کالجز کے درمیان ہونے والے منظوم اور نثر نگاری کے مقابلوں میں بھی پوزیشن حاصل کرتا رہا۔

خوشی محمد طارقؔ کا اصل میدان غزل گوئی ہے۔ تاہم قطعات اور موضوعاتی شاعری پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ ۱۹۹۶ء میں "پلکوں کے سائبان" کے نام سے شائع ہوا۔ جبکہ دوسرا مجموعہ "خواب کے زینے"

کے عنوان سے ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ایک اور اردو شعری مجموعہ اور کالمز پر مشتمل کتاب زیرِ اشاعت ہیں۔

ظفر وقار ظفرؔ

ظفر وقار ظفرؔ ۱۹۷۸ء میں گلگت شہر میں پیدا ہوئے۔ آپ گلگت بلتستان کے نامور شاعر عبدالخالق تاجؔ کے فرزند ارجمند ہیں۔ ظفر وقار ظفرؔ نے ابتدائی تعلیم پبلک سکول اینڈ کالج جٹیال سے حاصل کی۔ میٹرک اور ایف۔ ایس۔ سی کیڈٹ کالج رزمک سے امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ انہوں نے گریجویشن ایچ۔ ایٹ کالج اسلام آباد سے پاس کیا اور ایس۔ ایم لا کالج کراچی سے ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کی۔

ظفر وقار ظفرؔ نے ۲۰۰۳ء میں مقابلے کا امتحان پاس کر کے بطور اسٹنٹ کمشنر حکومت گلگت بلتستان میں پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا۔ اس وقت سیکڑی سروسسز اینڈ جنرل ایڈمنسٹریشن کے طور پر گلگت میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

ظفر وقار

ظفرؔ کو بچپن سے ہی گھر میں ادبی ماحول میسر تھا۔ والد سے شاعری ان کو ورثے میں ملی۔ یہی وجہ ہے ان کا اولین شعری مجموعہ "آکاس" زمانہ طالب علمی کے دوران یعنی میٹرک کے زمانے میں شائع ہوئی۔ ٹھیک ایک سال بعد "آنند" ان کا دوسرا شعری مجموعہ منظر عام پر آئی۔ جو ان کی کمال شعر گوئی کا مسلمہ ثبوت ہے۔

سخن گوئی میں ان کا محبوب میدان غزل ہے۔ اردو شینا دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں رومانوی رنگ زیادہ ہے۔ اس وقت مادری زبان شینا میں تین شعری مجموعے زیرِ ترتیب ہیں۔

حبیب الرحمٰن

مشتاقؔ

نام حبیب الرحمٰن اور تخلص

مشتاقؔ ہے۔ آپ ۳مارچ ۱۹۷۶ء کو کشروٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی سکولوں سے حاصل کی۔ بعد ازاں خومر ہائی سکول گلگت سے ۱۹۸۶ء میں میٹرک، عبداللہ ہارون کالج سے ۱۹۸۸ء میں انٹر میڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ آپ نے گریجویشن علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے جبکہ سندھ یونیورسٹی جامشورو سے ۱۹۹۸ء میں اکنامکس میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی۔

آپ نے پیشہ ورانہ

زندگی کا آغاز ۴ مئی ۱۹۹۰ء کو زرعی ترقیاتی بنک لمیٹڈ سے کیا۔ اس وقت آپ اسی بنک میں زونل آفس گلگت میں زونل منیجر کے عہدے پر فائز ہیں۔ حبیب الرحمٰن مشتاق کا شعری سفر زمانہ طالب علمی میں شروع ہوا۔ شعر و شاعری سے شغف اور شوق نے حبیب الرحمٰن کو شاعری کا حوصلہ دیا۔ یوں ان کو اردو میں شعر کہنے کا سلیقہ آ گیا۔ ان کا پہلا شعر یہ تھا:

گرے تنکا بھی تو احساس کی لو تھرتھراتی ہے

وجودِ حس میں پنہاں ہو گئیں باریکیاں کیا کیا

حبیب الرحمٰن مشتاقؔ نے شعر و شاعری کا آغاز حلقہ ارباب ذوق گلگت کے زیرِ اہتمام مشاعروں سے کیا۔ لیکن کچھ عرصہ گزارنے کے بعد دوستوں کی مدد سے فکری تحریک گلگت کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس کا انھیں سیکریٹری چنا گیا۔ اس وقت آپ اسی تنظیم کا چنیدہ صدر بھی ہے۔ سخن گوئی میں آپ کا اصل میدان اردو غزل ہے۔ آپ کی شاعری میں رومانیت کے ساتھ سماجی شعور کا عنصر غالب ہے۔ اب تک ان کی دو تصانیف شائع ہوئی ہیں۔ پہلا شعری

مجموعہ "ہوا نے چوڑیاں پہنی ہوئی ہیں" کے عنوان سے ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی۔ دوسرا شعری مجموعہ "کوئی موجود ہونا چاہتا ہے" کے نام سے ۲۰۱۲ء میں منظر عام پر آئی اور تیسرا اُردو شعری مجموعہ "میں کتنا بچتا ہوں" ابھی زیرِ ترتیب ہے۔

احسان شاہ

احسان شاہ ۱۶ اگست ۱۹۷۸ء کو گلگت کشروٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سلیمان شاہ کا تعلق گلگت کے نواحی گاؤں مناور سے تھا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ بعد ازاں تعلیم کے مختلف مدارج طے کرتے ہوئے سماجیات میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم کے بعد بحیثیت افسر تعلقات عامہ محکمہ ناردرن ایریاز ٹرانسپورٹ کارپوریشن سے منسلک ہو گئے۔ تاحال آپ اسی محکمے کا حصہ ہیں۔

احسان شاہ کے نانا مرحوم ادب نواز انسان تھے۔ ادب سے دلچسپی کی بنیاد پر وہ مشاعروں کا انعقاد اپنے گھر پر ہی کیا کرتے تھے۔ اس ادبی ماحول نے ان کے اندر کا شاعر جگا دیا۔ اور انہوں نے ابتدائی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ آپ کا اولین شعر یہ ہے:

چھت پر نکل گئے ہیں سبھی چاند دیکھنے

لیکن تمہاری دید کے ہم منتظر رہے

احسان شاہ

شعر و شاعری کے علاوہ قومی و علاقائی اخبارات میں مختلف موضوعات پر کالمز بھی لکھتے رہے۔ اب تک ان کی دو شعری مطبوعات "برف کے صحراؤں میں" اور "میرا خواب زیرِ چراغ تھا" منظر عام پر آ چکی ہیں۔ اس کے علاوہ نثری

میدان میں ان کا ایک سفر نامہ زیر ترتیب ہے۔ احسان شاہ کا اصل میدان غزل گوئی ہے۔ تاہم قطعات بھی لکھتے ہیں۔ ان کی شاعری کے نمایاں موضوعات میں رومانیت، سماجی اتار چڑھاؤ، سیاسی و سماجی استحصال کے خلاف مزاحمتی فکر نمایاں ہیں۔

اکبر حسین نحویؔ

نام اکبر حسین تخلص نحویؔ

ہے۔ آپ ۲۶ نومبر ۱۹۶۲ء کو ضلع نگر کے ایک گاؤں تھول میں پیدا ہوئے۔ والد گرامی کا نام شعبان علی تھا۔ آپ نے پرائمری کا امتحان پرائمری سکول نلت نگر سے پاس کیا۔ مڈل تا میٹرک تک تعلیم فیڈرل گورنمنٹ بوائز ہائی سکول چھلت نگر سے پاس کیا۔ انٹر بوائز کالج گلگت جبکہ گریجویشن کراچی یونیورسٹی سے ۱۹۸۵ء میں پاس کیا۔ گریجویشن کرنے کے بعد گلگت بلتستان میں محکمہ تعلیم کے ساتھ بطور مدرس منسلک ہو گئے۔ آپ نے دوران ملازمت سلطان الفاضل کا امتحان بھی پاس کیا۔ اسی دوران بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ سے بطور پرائیوٹ امیدوار کی حیثیت سے ایم اے اردو کا امتحان پاس کیا۔ آپ اس وقت انیسویں گریڈ میں محکمہ تعلیم ضلع نگر میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اکبر حسین نحویؔ کو سخن گوئی کا شوق کالج کے زمانے میں ہوا۔ اس دوران فیڈرل گورنمنٹ کالج گلگت کے واحد شاعر رر استاد ڈاکٹر حسین جعفر حلیم سے اصلاح بھی لیتے رہے۔ اسی کی دہائی میں مذہبی کتابوں میں شاعری کی تنقیص کے مفاہیم پڑھ کر شعر گوئی ترک کی۔ اور آئندہ پندرہ سال ترک سخن میں گزر گئے۔ مگر دوستوں کے اصرار پر سن ۲۰۰۰ء میں انجمن فکر و سخن نگر کی بنیاد ڈالی اور اس کی باقاعدہ سرپرست بن گئے۔ ۲۰۰۴ سے ۲۰۰۶ء تک اسی تنظیم کا باقاعدہ صدر بھی رہا۔

اکبر

حسین نحوی کو عربی زبان وادب کے ساتھ فارسی زبان پر بھی عبور حاصل ہے۔وہ غزل، نظم اور قطعات تینوں اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ان کا پہلا اردو شعری مجموعہ " حرفِ رفو" کے نام سے ۲۰۱۶ء میں طباعت کے زیور سے آراستہ ہوا۔ یہ، مجموعہ کلام سابق ریاست نگر کے کسی اردو شاعر کا پہلا مجموعہ کلام تھا۔ اس کے علاوہ دو شعری مجموعے "حرفِ نمو" اور "ظرف عدو" طباعت کے مرحلے میں ہیں۔ اس کے علاوہ افسانوں کا ایک مجموعہ بھی زیرِ ترتیب ہے

۔

عبدالحفیظ شاکرؔ

عبدالحفیظ شاکرؔ ۱۵

ستمبر ۱۹۶۵ء کو محلہ کُھربرمس گلگت میں پیدا ہوئے۔ آپ کے جد امجد کا تعلق کوہستان سے تھا۔ جو تقریباً دو سو سال قبل گلگت منتقل ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم امپھر گلگت سے حاصل کیا۔ بعد ازاں میٹرک ہائی سکول نمبر ا گلگت الیف۔ اے انٹر کالج گلگت اور گریجویشن سندھ یونیورسٹی جامشورو سے حاصل کیا۔ گزشتہ ۳۸ سالوں سے آپ محکمہ تعلیم گلگت بلتستان میں بطور مدرس خدمات انجام دے رہے ہیں۔

عبد الحفیظ شاکرؔ کو

مطالعے کا شوق بچپن سے تھا۔لہذا شعر و شاعری کے ساتھ نثر میں بھی طبع آزمائی کرتے رہے۔ اردو زبان کے علاوہ مادری زبان میں بھی شاہکار شعری اور نثری تخلیقات تخلیق کیے۔ انہوں نے تین سو سے زائد ڈرامے مادری زبان میں تخلیق کیے۔ حفیظ شاکرؔ ایک کامیاب شاعر ہونے کے ساتھ ایک فن کار بھی ہے۔ انھوں نے نہ صرف سٹیج ڈرامے تحریر کیے بلکہ سٹیج پر اداکاری کے جوہر بھی دکھائے۔ اس کے علاوہ مقامی اور ملکی اخبارات اور ادبی جریدوں کے لیے سینکڑوں کالم، مضامین اور مقالہ جات لکھ چکے ہیں۔

عبد الحفیظ شاکرؔ کی شاعری میں سماجی موضوعات

کے ساتھ مزاحمتی رنگ زیادہ ہے۔ آپ کا پہلا شعری مجموعہ "میں نہیں ہوں" کے عنوان سے ۲۰۰۵ء میں منظر عام پر آیا۔ دوسرا اُردو شعری مجموعہ زندگی کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اردو شعری مجموعہ "مزاج بدلے گا"، والد بزرگوار کی سیاسی اور سماجی خدمات پر مشتمل کتاب "خاموش مجاہد"، شناکلام پر مشتمل شعری مجموعہ "بُری کونے" اور شیناڈراموں پر مشتمل کتاب "شیناڈرامہ" زیرِ طبع ہیں۔

عبد الکریم کریمیؔ

عبدالکریم کریمیؔ تحصیل اشکومن ضلع غذر میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان واخان تاجکستان سے ہجرت کر کے اٹھارہویں صدی میں ضلع غذر اشکومن میں آکر آباد ہوا۔ ان کا تعلق علم و ادب کے بے تاج بادشاہ حضرت شیخ سعدی سے بتایا جاتا ہے۔ ان کے خاندان کو اشکومن میں لوگ شیخ کے نام سے جانتے ہیں۔ اور یہ اپنے نام کے ساتھ اکثر شیخ لکھا کرتے ہیں۔ آپ نے تعلیم کے مختلف مدارج طے کرتے ہوئے ۲۰۱۱ء میں قراقرم یونیورسٹی گلگت سے پولیٹیکل سائنس میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی۔ آپ کا تعلق اسماعیلی طریقت سے ہے۔ لہذا ۲۰۰۴ء سے اسماعیلی طریقہ بورڈ سے بطور واعظ منسلک ہے۔ شاعری کا آغاز زمانہ طالب علمی سے کیا۔ تب سے لے کر اب تک تسلسل کے ساتھ لکھتے چلے آرہے ہیں۔

کریمیؔ کو اردو شاعری کے ساتھ اردو نثر میں عبور حاصل ہے۔ فروغ ادب کے لیے ان کی کتابوں اور خصوصاً ان کی زیرِ ادارت شائع ہونے والا میگزین سہ ماہی "فکر و نظر" کا ادبی حلقوں میں اہم مقام رہا ہے۔۔ ان کا خصوصی کالمز گلگت بلتستان اور چترال کے مقامی اخبارات میں چھپتے رہے ہیں۔ آپ کی اہم تصانیف میں شاید پھر نہ ملیں ہم، فکر و نظر، تیری یادیں، سسکیاں اور تلخیاں (مضامین کا مجموعہ) شامل ہیں۔

ب۔ گلگت کی اردو شاعری میں مزاحمت کے سیاسی زاویے

ادب اور سیاست کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے۔یہ تعلق ازمنہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔سیاسی حالات و واقعات کا ادب میں بیان ،ادب میں سیاسی معاملات کی جھلک ،ادب کو اپنے زمانے کا عکاس بنانے کے ساتھ عصری شعور سے بھی بہرور کرتا ہے۔

سیاسی حالات و واقعات معاشرے کی تلخ حقیقت بن کر ادب کے وسیلے سے اظہار کی راہ پاتے ہیں۔ دنیائے ادب کے کسی بھی زبان کے ادیب اور شاعر اپنے گردو پیش میں رونما ہونے والے سیاسی حالات و واقعات اور شکست وریخت سے اثر لیے بنا نہیں رہ سکتا۔اسی لیے ادب میں سیاسی طور پر انقلابات کی راہ ہموار کرنے کی استطاعت اور طاقت موجود ہے۔

سیاست کا تعلق کسی نہ کسی مقام پر سرکار اور اس کے عمل سے وابستہ ہے۔سیاست، سرکار اور ریاست کے رشتوں کا مطالعہ ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاست کا مرکز و محور ہی ریاست اور سرکار ہے۔سیاست کسی نہ کسی ملک میں رہنے والے لوگوں کو کسی حد تک اپنے نظریات اور اصولوں سے متاثر ضرور کرتی ہے۔یہیں سے سیاست اور شاعری کا راستہ شروع ہوتا ہے۔

تاریخی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گلگت بلتستان میں زمانہ قبل از مسیح خود مختار اور آزاد حکومتیں رہی ہیں۔البتہ ماضی میں بنے والی حکومتوں اور ریاستوں کی سرحدیں وقتاً فوقتاً پھیلتی اور سکڑتی رہی ہیں۔

دستیاب تاریخی حقائق کے مطابق ۷۰۰ء میں گلگت ریجن میں باقاعدہ حکومتوں کا ذکر ملتا ہے۔ اس دور میں یہاں کا حکمراں اوراگو تھم تھا۔پھر مختلف خاندانوں کی یہاں حکومتیں قائم رہیں۔۱۸۴۶ء کے عوائل میں گلگت کی مقامی حکومت پر پہلے انگریزوں نے بعد ازاں سکھوں نے قبضہ کیا۔اس ناجائز قبضے کے خلاف مقامی راجا،راجہ گوہر امان نے مزاحمت شروع کی۔یوں ایک بار پھر ۱۸۵۲ء میں راجہ گوہر امان نے مقامی حکومت قائم کی۔۱۸۳۶ء میں یہاں کی مقامی حکومت پر ڈوگروں نے پھر قبضہ کیا۔۱۹۳۶ء میں انگریزوں نے گلگت ریجن کو مہاراجہ کشمیر سے ۶۰ سالہ پٹے پر حاصل کیا۔اس طور یہ علاقہ کچھ عرصے کے لیے مہاراجہ کشمیر کے زیر تسلط بھی رہا۔گلگت ریجن میں شروع دن سے ڈوگروں اور انگریزوں کے ناجائز قبضے کو

عوام نے تسلیم نہیں کیا تھااور دلوں میں شدید نفرتیں پروان چڑھتی رہیں۔ اس طرح یکم نومبر ۱۹۴۷ء کو یہاں کے عوام نے منظم بغاوت کر کے گلگت کو آزاد کرالیا گیا۔

شروع میں گلگت میں کچھ دن عبوری حکومت قائم رہی۔ تاہم عبوری حکومت کی طرف سے پاکستان کے ساتھ الحاق کے حق میں کیے گئے فیصلے کی روشنی میں حکومت پاکستان سے علاقے کا انتظام سنبھالنے کی درخواست کے جواب میں پاکستان کے پہلے پولیٹیکل ایجنٹ کے طور پر سردار محمد عالم خان نے گلگت آکر حکومت کی بھاگ دوڑ سنبھال لی۔ اس طرح ۱۶ نومبر ۱۹۴۷ء کو ساتھ عملی قیام عمل میں آیا۔

بد قسمتی سے سن سینتالیس سے لے کر اب تک کئی سال گزرنے کے باوجود اس خطے کو ابھی تک آئینی شناخت نہیں ملی۔ جس کی وجہ سے یہاں کے لوگوں میں احساسِ محرومی بہت زیادہ حد تک بڑھ گئی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وفاقی حکومتوں کی طرف سے کی جانے والی ظلم و زیادتی کے خلاف عوامی حلقوں کی طرف سے شدت کے ساتھ صدائے احتجاج بھی بلند ہونے لگی ہے۔

گلگت بلتستان کے اردو شعراء نے عوام کے دکھ درد اور غم و غصے کو محسوس کرتے ہوئے اپنے تخلیقات کے ذریعے آواز حق بلند کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اسی سلسلے میں گلگت کے منتخب اردو شعراء کے ہاں جبر و استبداد، جمہوری استحصال، استحصالی نظام، سیاسی جبر، زبان بندی اور احساس محرومی کے حوالے سے مزاحمتی رویوں کا جائزہ لیں گے۔

عبدالخالق تاجؔ کا شمار گلگت بلتستان کے سینیر ترین شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کا طرز سخن طنز و مزاح پر مبنی ،دل کو چھونے والا اور گدگدانے والا ہوتا ہے۔ گلگت بلتستان کو وفاقی حکومت کی جانب سے کئی سال گزرنے کے باوجود آئینی شناخت نہ دینے پر تاجؔ صاحب یوں تنقید کرتے ہیں:

بڑی مشکل سے آزادی ملی ہے

مگر آئین سے خالی ملی ہے

وہ لے کے چل دیے آئین کے پھل

ہمیں خالی یہاں تھالی ملی ہے

شہیدو! میرے گلشن کے گلوں میں

تمہارے خون کی لالی ملی ہے (۴)

ہمارے ملک میں بد قسمتی سے سیاسی نظام اس قدر کمزور ہے کہ غریب کے حقوق کی تحفظ کرنے کے بجائے مزید ان کا استحصال کیا جاتا ہے۔ ہمارے جمہوری نظام میں اتنی طاقت نہیں کہ سرِ عام ہونے والی غریبوں کی استحصال کو روک سکے۔ یوں استحصالی قوتیں مزید طاقت کے ساتھ معاشرے پر چھا جاتا ہے۔ اس کا نقشہ عبد الخالق تاجؔ یوں کھینچتے ہیں:

جفاکش اور محنت کش یہاں بد حالا رہتے ہیں

یہاں جو کچھ نہیں کرتے وہ مالا مال رہتے ہیں

یہاں جن کی حکومت ہے کراچی سے قرمبر تک

وہ سب میری طرح پی کر یہاں بے حال رہتے ہیں

ڈسے جاتے ہیں جن سے پھر انہی کو ووٹ دیتے ہیں

ہمارے ملک میں اے دوستو! گومال رہتے ہیں(۵)

جس ملک میں جبر و استبداد کی قوتیں مضبوط ہو۔ وہاں آدمی کو موت سے زیادہ زندگی سے خوف آتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ عوام مزاحمت کرنے کی بجائے انہیں استبدادی قوتوں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ تاجؔ صاحب قوم کی اس مجرمانہ خاموشی کو اجتماعی خودکشی قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

میں موت سے تو نہیں زندگی سے ڈرتا ہوں

اب اپنے شہر میں ہر کسی سے ڈرتا ہوں

ازل سے ظلم و ستم کا کوئی علاج نہیں

اے چارہ گر میں تری بے بسی سے ڈرتا ہوں

امیر وقت کی سب ہاں میں ہاں ملاتے ہیں

میں اپنی قوم کی اس خود کشی سے ڈرتا ہوں (۶)

عبد الخالق تاجؔ استحصالی طاقتوں کے بیانیے کو کسی صورت ماننے کے لیے تیار نہیں۔ وہ مظلوم و محکوم کشمیریوں پر کی جانے والی بھارتی ریاستی جبر کے خلاف یوں بر سرِ پیکار نظر آتے ہیں:

تیرے ہاتھوں میں اگرچہ حرملہ کا تیر ہے

میرے ہاتھوں میں اسد اللہ کی شمشیر ہے

شمر کا قبضہ ہے اب بھی وادی کشمیر میں

کیا مری جنت کسی کے باپ کی جاگیر ہے

رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو کشمیر میں

بچہ بچے کی زباں پر نعرہ تکبیر ہے (۷)

جمشید خان دکھی کا شمار گلگت بلتستان کے مستند شعراء میں ہوتا ہے۔ان کی شاعری میں معاشرتی تضادات کی واضح جھلک ملتی ہے۔وہ عام آدمی کے جذبات کو شعری قالب میں ڈھالنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔

گلگت بلتستان کے آئینی اور سیاسی حقوق کے حوالے سے لکھی گئی ان کی نظم "دھرتی ماں کے نام" کے ہر اشعار اس قدر مقبول عام ہیں جس کی کوئی مثال نہیں۔یہ نظم اپنی نوعیت میں بھرپور مزاحمتی رنگ لیے ہوئے ہیں۔

مری دھرتی تو میری آبرو ہے

تری تصویر پیہم روبرو ہے

شبِ ظلمت کا ہو گا کب سویرا

اندھیرا ہی اندھیرا چار سو ہے(۸)

آزادی سے لے کر اب تک کئی سال گزرنے کے باوجود گلگت بلتستان کے باسی آئینی و قانونی حقوق سے محروم ہیں۔وفاقی حکومت کی طرف سے کی جانی والی اس زیادتی کے خلاف دکھی حکومت پاکستان سے یوں مخاطب ہیں:

ہم سے بھی حالِ زار چمن پوچھیے حضور

ہم بھی ہیں اہلِ دیس، غریب الوطن نہیں(۹)

معروف شاعر اور صحافی خوشی محمد طارق نے بجا طور پر دکھی کو ارض شمال کا حبیب جالب کے خطاب سے نوازا تھا۔جمشید خان دکھی ظلم و ستم اور جبری زبان بندی اور استحصالی قوتوں کو کبھی نہیں مانتے۔پرویز مشرف دور میں معروف ایٹمی سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی جبری نظر بندی پر اپنے جذبات کا یوں اظہار کرتے ہیں:

ملک آزاد یہ جو ہوتا قدیر

اہلِ منصب میں نام ہو جاتا

تُو کہ پیدا جو ہند میں ہوتا

تھا یقین بوالکلام ہو جاتا (۱۰)

جمشید دکھیؔ نے مسلم حکمرانوں کی مسلم کُش اور امریکہ نواز پالیسیوں کو ہمیشہ ہدفِ تنقید بنایا۔ دکھیؔ اسی ضمن میں یوں گویا ہے:

ہمارے حکمرانوں کے یہ تیور دیکھے جاتے ہیں

مسلمانوں کے حاکم ہیں نصاریٰ کے وہ آلے ہیں

ہے کتنا دبدبہ دنیا میں پاپائے کلیسا کا

کہ جس کے سامنے اہلِ خرد بھی ڈھیلے ڈھالے ہیں

مجھے اہلِ وطن کی یہ خموشی مار ڈالے گی

نہیں اظہار پر بندش لبوں پر پھر بھی تالے ہیں(۱۱)

ایک حق گو تخلیق کار حاکمِ وقت کی بھول چوک کو کیسے برداشت کر سکتا ہے؟ اس لیے سچ کہنے والے اور سچ سے پیار کرنے والے فنکار اور تخلیق کار کی شاعری انسان دوست اور سچی شاعری ہوتی ہے۔ امین ضیاءؔ کی شاعری بھی بہتر نظام کی خواہش کی اظہار ہے۔ ان کی شاعری غربت ، بھوک و افلاس کے خلاف ، بد دیانتی ، بد عہدی اور ظلم و جبر کے خلاف ایک جہاد ہے۔ ان کی شاعری سماج کو بغاوت پر اکسانے کی بجائے اپنا حق مانگنا سکھاتی ہے۔ گلگت بلتستان کے عوام میں آئینی شناخت نہ ہونے کی وجہ

سے شدید مایوسی پائی جاتی ہے۔ ستم بالائے ستم حکومتِ پاکستان کی طرف سے اب تک اس خطے کو سرزمینِ بے آئین کے طور پر رکھنا اس مایوسی اور محرومی میں مزید اضافے کا باعث بنتا ہے۔ امین ضیآء نے اپنی نظم 'گلگت بلتستان" میں پاکستان اور گلگت بلتستان کا ایک دوسرے کے ساتھ موازنہ کر کے گلگت بلتستان کے باسیوں کی زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے اس نظم میں بھی مزاحمتی لہجہ نمایاں ہے۔

وہاں بٹوارے کے حامل کا اک عنوان بنایا ہے

یہاں پر قوتِ بازو سے پاکستان بنایا ہے

یہاں اردو ہی پاکستانیت کی خوش علامت ہے

وہاں لسانیت کے فرق کو صد جاں بنایا ہے

اتارو تم گلے سے شکوؤں کا کشکولِ آزادی

اصل آزاد ہو تم، تم نے پاکستان بنایا ہے(۱۲)

گلگت بلتستان کے عوام پر جبر و استبداد کی طاقتیں جمہوریت کا لبادہ اوڑھے ہر دور میں مسلط رہی ہیں۔ یہی استحصالی طاقتیں یہاں کے عوام کو حقوق دینے کی بجائے ان کو مزید تاریکی میں دھکیل دیتے ہیں۔ امین ضیآء اسی احساس محرومی سے بھر پور گھٹن زدہ ماحول کا یوں نقشہ کھینچتے ہیں:

لاکھ کوشش کی مگر فکر کو پیکر نہ ملا

ہو بہم لفظ تو میں ایک گھٹن سے نکلوں

صورتیں ساری ہی نادیدہ ہیں اس بستی میں

کیا بہانہ کروں اور ایسے وطن سے نکلوں

مرا ارمان کہ دامانِ وفا نہ چھوٹے

تیرا فرمان کہ میں خوئے کہن سے نکلوں

فکر فردا میں رکھ اس درجہ پریشاں مجھ کو

محوِ اندیشہ، غم دار و رسن سے نکلوں(۱۳)

دنیا جہاں کے تمام استعماری اور استبدادی طاقتیں سچ بولنے والوں اور سچ کی تصویر دکھانے والوں کو کبھی برداشت نہیں کرتا۔ کیونکہ تاریکی میں ضیاء بانٹنے والا ان استعماری طاقتوں کے لیے سب سے خطرناک ہوتا ہے۔ اس لئے وہ بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ کسی نہ کسی طرح ایسے لوگوں کو ابھرنے نہ دیا جائے۔ امین ضیاؔء اسی حقیقت کو یوں آشکار کرتے ہیں:

جنہوں نے ہاتھ اٹھا کر سدا دعائیں دیں

انہی کو خون میں تر دہر نے قبائیں دیں

نہ پھر اٹھا کوئی منصور شہر عرفاں سے

فقیہ شہر نے وہ ناروا سزائیں دیں(۱۴)

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سچ کا راستہ پُر خطر راستہ ہے۔ سہل پسند ذہن اور مصلحت پسند ذہن کا اس راستے سے گزرنا محال ہے۔ یہاں تو سر ہتھیلی پہ رکھ کر دار و رسن کو چومنا ہوتا ہے۔ نرم گرم بستروں میں بیٹھ کر رمزِ قلندری حاصل کرنا ایک ناممکن بات ہے۔ امین ضیاؔء اسی بات کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

حیات بند و سلاسل تو گزر آئی

اب آئے راہ میں سدِّ سکندری آئے

جسے ہے خوف سلاسل سے دار و مقتل سے

اسے یہ چاہ کہ رمزِ قلندری آئے(۱۵)

استحصالی طاقتوں کی طرف سے زبان بندی کے خلاف امین ضیاؔء یوں جراتِ اظہار کرتے ہیں:

بات نوکِ قلم سے ٹپکے گی

لاکھ اپنے لبوں کو سی لوں میں

حق پرستوں سے حق کا وعدہ ہے

غرق فرعون ہوں گے نیلوں میں(۱۶)

خوشی محمد طارقؔ کا شمار گلگت بلتستان کے قد آور شعراء میں ہوتا ہے۔ان کی شاعری کا سب سے بڑا حوالہ معاشرے کے تضادات ہیں جن کو انہوں نے قلب کی گہرائیوں سے محسوس کیا ہے۔سیاسی اور سماجی اتار چڑھاؤ کے حوالے سے ان کے ہاں گہرا طنز پایا جاتا ہے۔سن سینتالیس سے لے کر اب تک گلگت بلتستان کے لوگوں کا سیاسی حوالے سے مسلسل استحصال ہوتا چلا آرہا ہے۔روزگارِ زندگی، مناسب تعلیمی نظام، صحت کا بہتر نظام اور انفرا سٹکچر کی بہتر سہولیات نہ ہونے کی وجہ سے یہیں کے لوگ انتہائی مشکل میں زندگی گزار رہے ہیں۔اس کے علاوہ ریاست اس علاقے کے لوگوں کے ساتھ تیسرے درجے کی شہری جیسا سلوک روا رکھتے ہیں۔خوشی محمد طارقؔ نے ریاست کی اسی منافقانہ رویوں کو یوں ہدف تنقید بنایا ہے:

بادِ سم آلودہ کو بادِ صبا کیسے کہوں

نالہ بلبل کو بلبل کی نوا کیسے کہوں

جگنوؤں سے چھین لیں جس دہر میں سورج کرن

ایسی ظلمت کی چمک کو میں ضیاؔء کیسے لکھوں(۱۷)

وفاقی حکومت نے گلگت بلتستان کے باسیوں کے ساتھ جو ناروا سلوک تسلسل کے ساتھ اب تک روا رکھا، اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی احساس محرومی اور بے یار و مد گاری کی طرف خوشی محمد طارق اشارہ کرتے ہوئے ایوان اقتدار میں غفلت کی نیند سونے والوں کو یوں جنجھوڑتے ہیں:

چمکیلے یہ شہر بھلا کیا کرب کو سمجھیں گاؤں کے

کس نے دیکھے ننگے بچے، بے بس چہرے ماؤں کے

خوش بختوں میں پھول ستارے سب کے سب تقسیم ہوئے

دشت نوردوں کی قسمت میں چھالے آئے پاؤں کے

غم کے ماروں کی قبروں پر پھول کی مالائیں مت رکھ

پہلے کیا کم ہار پڑے ہیں اشکوں کی مالاؤں کے (۱۸)

پھیلنے لگے بادل اونچے کوہساروں پر

چھا گئی اداسی پھر شامِ غم کے ماروں پر

کاٹھ کے کھلونے ہیں ہم کسی کے ہاتھوں میں

ناچنا ہے قسمت میں ڈور کے اشاروں پر

جو خزاں کے موسم میں پاس تک نہیں آئے

آج حق جتاتے ہیں باغ کی بہاروں پر (۱۹)

سماج میں ہونے والی ظلم و زیادتی کے خلاف، استحصالی طاقتوں کی طرف سے آزادی اظہار پر لگانے والی جبری پابندی کے خلاف خوشی محمد طارقؔ یوں صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں:

یہ کیسی آزادی ہے اے میرے شہر کے سائیں

لب کھلتے ہی اٹھ جاتی ہیں دو دھاری شمشیریں

اہل وغا، الزم بغاوت، دار و رسن، بدنامی

وقت کے منصوروں پر لگتی رہتی ہیں تعزیریں

لوگ تو عائد کر دیتے ہیں جسموں پر پابندی

کون مگر پہنا سکتا ہے جذبوں کو زنجیریں

بھوک کے پیٹ نہیں بھر سکتے آقاؤں کے وعدے

کب خالی باتوں سے بدلیں قوموں کی تقدیریں(۲۰)

سماج میں استحصالی طاقتوں کی طرف سے کی جانے والی ظلم و زیادتی کے خلاف حبیب الرحمٰن مشتاق بھی سینہ سپر ہو کر آواز حق بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کا شمار گلگت بلتستان کے سینیر ترین شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کے ہاں سیاسی سماجی مزاحمتی رویے زیادہ ہیں۔ ریاست کی طرف سے عوام پر کی جانے والی ظلم و زیادتی کا نقشہ وہ یوں کھینچتے ہیں:

لہو کی آبرو، بے آبرو ہے

زمین نے سرخیاں پہنی ہوئی ہے

ہمارے آشیاں کی خیر مالک

فلک نے بجلیاں پہنی ہوئی ہیں

ستم کی انتہا ہے فصلِ گُل میں

چمن نے زرد یاں پہنی ہوئی ہیں(۲۱)

جبر کے خداؤں کو کون جا کے بتلائے

صبر سے پرے برپا انقلاب ہوتے ہیں(۲۲)

مجھے وہ تول کر انصاف دینگے

مرے منصف ترازو لا رہے ہیں

شبِ ظلمت کا چہرہ نوچ لیں گے

اجالے ساتھ جگنو لا رہے ہیں(۲۳)

اچھا شعر ماحول اور روایات کے اندر سے پانی کے چشمے کی طرح پھوٹتا ہے۔ احسان شاہ کی شاعری پر اگرچہ رومان غالب ہے۔ اس کی بنیادی وجہ قدیم تہذیبی روایات ہیں۔ لیکن غزل گو شاعر ہونے کے باوجود ان کی غزلوں میں جگہ جگہ مزاحمتی عناصر نظر آتے ہیں۔ ظالم و جابر حکمرانوں سے وہ یوں مخاطب ہے:

جو سولی پر بھی جا کر بولتا ہے

ضمیر اس کا ابھی جاگا ہوا ہے

ہوا اس کی بگاڑے گی بھلا کیا

لہو سے جو دیا روشن ہوا ہے(۲۴)

مکار اور منافق حکمراں اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے بعض اوقت پارساوں کا روپ بھی دھار لیتے ہیں۔ لیکن سچ کو جان کر سماج کو سچی تصویر دکھانے والے ان کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اور ایسے روشن چراغوں کو جلد بجھا دیا جاتا ہے۔ احسان شاہ حکمرانوں کی اسی منافقانہ روش کا یوں پردہ چاک کرتے ہیں:

شہر بھر کے رہزنوں نے آج کل

روپ دھارا رہنماؤں کی طرح

آستین میں سینکڑوں پالے ہیں سانپ

ان کی باتیں پارساؤں کی طرح(۲۵)

لہو جو موج میں آکر رگوں کو توڑے تو

نظر رکھو کہ ابلتا ہے کس روانی سے

جو سچ کہوں تو ہمارے بھی شہر میں احسانؔ

لہو کی قدر زیادہ نہیں ہے پانی سے(۲۶)

احسان شاہ کا تعلق حق پرستوں کے قبیل سے ہیں۔ اس لیے وہ محکوموں اور مجبوروں پر سماج میں ہونے والی ظلم زیادتی پر استحصالی طاقتوں کے خلاف بھرپور مزاحمت کرتے نظر آتے ہیں۔

اونچی رہے جس دور میں مغرور کی آواز

دب جاتی ہے اس عہد میں مجبور کی آواز

اس دور کے سلطان جو چاہیں وہ کریں گے

گونجے گی کہاں پھر کسی منصور کی آواز

ممکن نہیں اس دور میں ایوان ہلا دے

دم توڑتی یارو کسی مزدور کی آواز(۲۷)

سیاسی طور پر گلگت بلتستان کے لوگوں پر ہونے والی ظلم و زیادتی اور جبر و استحصال پر اکبر نحوی بھی خاموش نہیں رہتا۔ بہت سارے سیاسی شعبدہ گر جھوٹے وعدوں کے ذریعے عوام سے ووٹ لے کر ایوان اقتدار تک پہنچ تو جاتے ہیں۔ لیکن بعد میں عوام کی نمائندگی کرنے کے بجاے وفاق کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس طور عوامی مطالبات پھر دب جاتے ہیں۔ اکبر حسین نحوی ایسے منافقانہ رویوں کو یوں آشکار کرتے ہیں:

صدیوں سے تعاقب میں ہیں ہم دیب جلا کر

عفریت غلامی کا بلا کیوں نہیں جاتا

دنیا نے یزیدوں کا علم اوڑھ لیا ہے

سردار مراکب وبلا کیوں نہیں جاتا

سوچو تو صحیح وقت کے فرعون کے دل سے

ہر حال میں وہ خوف عصا کیوں نہیں جاتا

سرگوشیاں دیمک ہیں ترے دیس کی نحوی

سرکار کا پیغام کھلا کیوں نہیں جاتا(۲۸)

گلگت کے اردو شعراء کے درج بالا اشعار ان کے سیاسی رد عمل کی فوری پیداوار کہا جا سکتا ہے۔ یہ اشعار بلا شبہ دیکھی ہوئی حقیقت کو دلیرانہ انداز میں بیان کرتی ہیں۔ یقیناً یہ اشعار ایک مخصوص پسِ منظر کے بغیر معرض وجود میں نہیں آسکتی۔ گلگت کے شعراء نے دراصل اپنی شاعری کے وسیلے سے استحصالی نظام، ظلم و ستم اور جبر و استبداد کا پردہ چاک کرنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے سماج میں مایوسی اور احساس محرومی شدت سے پھیل رہی تھی۔ اس کے تدارک کے لیے فوری طور پر متحرک ہو کر عملی اقدام کرنا ضروری تھا۔

اسی عظیم مقصد کے تحت گلگت کے اردو شعراء نے حقیقت کے جراحت کو موثر بنانے کے لیے طنز کے اسالیب کو اس انداز سے برتا ہے کہ عوامی شعور سیاسی طور پر نہ صرف متاثر ہوا بلکہ تبدیلی کو روبہ عمل لانے کے لیے بھی تیار ہوا۔

ج۔ گلگت کی اردو شاعری میں مزاحمت کے سماجی زاویے

سماج لوگوں کا وہ گروہ ہے جو کسی نظام کے تحت مل جل کر زندگی گزارتے ہوں۔ شاعری سماج اور معاشرے کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس لیے شاعری میں سماج کے ہر رُخ کو ادب کا خزینہ بنانے کی استطاعت ہوئی ہے۔

کوئی ادیب یا شاعر اپنے سماج اور ماحول سے کٹ کر یا الگ رہ کر زندہ ادب تخلیق کر ہی نہیں سکتا۔ ادیب یا شاعر حساس طبیعت کا مالک اور باشعور انسان ہونے کی وجہ سے معاشرے میں ہونے والی اتار چڑھاؤ اور تبدیلیوں کو نہ صرف فوراً سمجھ جاتا ہے۔ بلکہ انتہائی گہرائی سے سماج کا مطالعہ کر کے سماجی مسائل کو اپنی تخلیقات میں تمام تر جزئیات سمیت بیان کرتا ہے۔

شاعری کے کئی اہم پہلو ہے۔ خاص طور پر مزاحمتی شاعری کے تخلیق کار سکوت اور خاموشی کا مخالف ہوتا ہے۔ اس لیے ہر دور میں ایسے ادیب اور شاعر نہ صرف متحرک رہتا ہے بلکہ سماج کے ٹھہرے پانی میں تحرک پیدا کرنے کی بھرپور سعی بھی کرتا رہتا رہا ہے۔

دنیا کے تاریخ ادب اس بات کی گواہی دیں گے کہ دنیا جہاں کے شاعروں، ادیبوں اور قلم کاروں کے تحریروں میں عدل، حسن، مساوات، اور عمل خیر کی تبلیغ و اشاعت کو اولیت حاصل رہی ہے۔ ادیب، شاعر اور قلم کار چاہے کسی بھی مذہب ، قوم ، ملک، زمانے اور نظریے کا ہو، ہمیشہ عظمتِ انسان اور شرف انسان کی بھلائی کی بات کرتا رہا ہے۔ اگر دنیا کے عظیم شاعروں کی فہرست مرتب کی جائے تو ان شعراء کا کُل اثاثہ حیات دنیا بھر کے انسانوں کی بہتر زندگی کے لیے تسلسل سے جدوجہد کی روایت میں نظر آتا ہے۔

دنیا جہاں کے انسان دوست تخلیق کاروں کی طرح گلگت کے اردو شعراء نے بھی اپنے زمانے کے انسانیت کے خلاف ہونے والی ظلم و زیادتی اور سماجی استحصال کے خلاف نوکِ قلم سے مسلسل صدائے احتجاج بلند کرتا رہا ہے۔ ذیل میں گلگت کے منتخب اردو شعراء کی شاعری میں سماجی مزاحمت کے ذیل میں سماجی استحصال ، مذہبی شدت پسندی ، مذہبی تعصبات، مذہبی منافرت، ثقافتی جبر، ناانصافی، عدالتی رویے اور انسانی رویوں جیسے موضوعات پر مزاحمتی عناصر کا مطالعہ کریں گے۔

عبدالخالق تاجؔ گلگت بلتستان کی اردو شاعری کے مزاحمتی باب میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ سماج میں ہر تخلیق کار انسانیت دوست ہوتا ہے۔ اس کا مطمع زندگی انسان سے محبت اور انسانیت کا درس ہے۔ بدقسمتی سے گلگت کی سرزمین اسی کی دہائی سے لے کر ۲۰۱۶ء کے تک انسان مخالف اور سماج دشمن عناصر کی شر انگیزیوں کی زد میں رہا۔ جس کی وجہ سے سرزمین گلگت کی امن کو شدید نقصان پہنچا۔ عبدالخالق تاجؔ نے تعصب پھیلانے والے مذہبی ٹھیکداروں پر نہ صرف کڑی تنقید کی بلکہ جہاں جہاں موقعہ ملا عوام کو ان کا اصل چہرہ دکھانے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔ وہ تعصب، نفرت اور اور انسانی رویوں پر یوں گویا ہیں:

تری تقریر سے پھیلی ہے واعظ

تعصب کی یہ بیماری زیادہ

خدا کے نام پر ہم کر رہے ہیں

جہنم کی یہ تیاری زیادہ (۲۹)

یہ مسلک کے علمبر دار تم ہو

تعصب کے بڑے بیمار تم ہو

جناب شیخ ہم مے خوار ہیں تو

امن کی راہ میں دیوار تم ہو (۳۰)

گلگت بلتستان کی اردو شاعری میں جمشید خان دکھی کو مزاحمتی شاعری کا امام سمجھا جاتا ہے۔ دکھی کا مسلک امن و محبت اور بھائی چارہ ہے۔ اس لیے سماج میں ہونے ہونے والی ظلم و زیادتی، جبری استحصال، مذہبی منافرت، تعصب، فرقہ پرستی جیسے سماج دشمن رویوں کے خلاف کھل کر مزاحمت کی ہے۔ سرزمین گلگت میں پھیلنے والی مذہبی شدت پسندی کی آگ سے شہر امن کی تباہی پر دکھی یوں نوحہ کناں ہیں:

روش لوگوں میں الفت کی نہیں ہے

وطن فردوس سے بڑھ کر حسین ہے

تعصب نفرتیں اب کاشت کر لو

بڑی رزخیز گلگت کی زمیں ہے (۳۱)

اسلام امن و محبت اور بھائی چارے کا دین ہے۔ لیکن مذہبی تعصب اور منافرت کی وجہ سے مسلمان ایک دوسرے کا دست گریباں ہیں۔ جمشید دکھی ایسے شدت پسند ملاؤں کا اصل چہرہ دکھاتے ہوئے ان کے راستے سے یوں بغاوت کا اعلان کرتے ہیں:

تعصب سے بھرا پیغام ہے یہ

بہاؤ خون درسِ عام یہ ہے

مسلمانوں کا جب انجام یہ ہے

میں کافر ہوں اگر اسلام یہ ہے (۳۲)

ظفر و قار ظفرؔ کا شمار گلگت کے نوجوان شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ بھی اسی نسل کے پروردہ ہیں۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے نہ صرف مذہب، مذہبی رسومات اور ملائیت بلکہ سماج دشمن عناصر کے رویے معاشرے میں کمزور طبقوں پر ہونے والی ظلم و زیادتی اور معاشرے میں عدل و انصاف کے نظام کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ اگرچہ ان کی شاعری میں فلمی شاعری کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن وہ ماحول کی چیرہ دستیوں کے آگے سر جھکانے کی بجائے ان سے نبرد آزما ہونے کو تیار ہیں۔ ظلم و زیادتی اور ناانصافی پر خاموش رہنا ان کا منصب نہیں۔ "آکاس" میں شامل ان کی نظم "بے نوا" میں وہ یوں گویا ہیں:

اس غنیم شہر کے، امیر کیا، غریب کیا،

سب وہی ہیں ایک سے، کرتے ہیں جو کہتے نہیں

کہتے ہیں جو کرتے نہیں، ایسے میں کس کو ڈھونڈھیے، کیا پایئے

جی چاہتا ہے کچھ کہیں، خاموش بھی رہ نہ سکیں

اور جو کہیں وہ بے اثر، کون سنتا ہے یہاں

ہم جیسے لوگوں کی پکار (۳۳)

سماج میں انسانی رویے شروع سے انسانیت کے خلاف محبت، مروت، اخوت اور بھائی چارہ گی کے خلاف زہر گھولتے چلے آئے ہیں۔ معاشرے میں انسانی منافقانہ رویوں کی مثال درج ذیل اشعار میں ظفر و قار ظفرؔ نے نہایت خوب صورتی سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

یوں تو دشمن بھی بڑے عیار تھے

کچھ ہماری صف میں بھی غدار تھے

جب مناصب بٹ رہے تھے شہر میں

سارے بے سر طالبِ دستار تھے

سب ریاکاروں سے آراستہ گئیں

چُپ رہے جو صاحب کردار تھے

ایک کالم تھا ادب کا اور بس

چور، ڈاکو زینتِ اخبار تھے(۳۴)

"آکاس" اور "آنند" کی شاعری ظفرؔ کے ایامِ نوجوانی کی شاعری ہے۔ رومان کا غلبہ ہونے کے باوجود انہوں نے سماج سے رشتہ منقطع نہیں کیا۔ ان کا سماجی شعور پختہ ہے۔ وہ معاشرے میں رائج نظام عدل کا اصل چہرہ یوں دکھاتے ہیں:

سوال تھا مرے منصف تمہاری عزت کا

سزائیں جھیلیں ہیں جو ہم نے بے خطا ہو کر

درخت کاٹ دیے سارے گھونسلوں والے

پرندے جائیں تو جائیں کہاں رہا ہو کر (۳۵)

حبیب الرحمٰن مشتاق اگرچہ عشق و محبت کی داستان بھی نہایت چابک دستی سے شعری پیرایے میں رقم کرتے چلے آئے ہیں لیکن ان کا سماجی شعور بہت پختہ ہے۔ وہ اپنے آپ کو سماج سے بالکل جدا نہیں رکھتا۔ سماج میں ہونے والی ہر ظلم و زیادتی، ناانصافی اور انسانیت مخالف رویوں کے خلاف وہ سراپا احتجاج کرتے نظر آتے ہیں۔ انسان کے روپ میں فرعونیت کا لبادہ اوڑھے جبر کو مسلط کر کے شہر کی امن اور بھائی چارے کی فضا کو برباد کرنے والوں کا وہ یوں پردہ چاک کرتے ہیں:

رعونت اوڑھ کے یہ شہر کیا ہونے لگا ہے

یہاں ہر خاک کا پتلا خدا ہونے لگا ہے

فصیلِ مقتل شب پر لکھا ہے نام کس کا

یہ کس کا تذکرہ اب جابجا ہونے لگا ہے

ہوائے دشتِ ہجراں ہو گئی ہے جب سے وحشی

مری امید کا مدہم دیا ہونے لگا ہے (۳۶)

معاشرے میں بھوک، غربت اور افلاس وہ سماجی مائل ہیں جن سے کچھ اور مسائل بھی جنم لیتے ہیں۔ دنیا جہاں کے سماجی شعور رکھنے والے قلم کار غربت و افلاس سے مارے عوام کا چہرہ حکمرانوں کے سامنے رکھنے سے کبھی گریز نہیں کرتے۔ غربت اور مفلسی سے مفلوک الحال سماج کا نقشہ حبیب الرحمٰن یوں پیش کرتے ہیں:

دشتِ غربت میں تقاضائے شکم جانتے ہیں

بھوک کمزوری مخلوق ہے، ہم جانتے ہیں

جس کی تقدیر میں ہے دربدری دنیا

ہم وہ انسان ہیں، انسان کا غم جانتے ہیں(۳۷)

شہر گلگت کے نابغہ روز گار شاعر احسان شاہ کا سخن گوئی میں اصل میدان غزل گوئی ہے۔"برف کے صحراؤں سے" شروع ہونے والا ان کا شعری سفر "مرا خواب زیرِ چراغ تھا" سے ہوتے ہوئے آج بھی آب و تاب کے ساتھ جاری و ساری ہے۔احسان شاہ نے غزل لکھنے کے باوجود ان کی شاعری میں مزاحمتی عناصر جابجا موجود ہیں۔وہ ظلم و جبر کے سامنے خاموش رہنے کو حرفِ ملامت سمجھتے ہیں۔استحصالی طاقتوں اور سماج دشمن عناصر کے خلاف احتجاج کرنا وہ فرض عین سمجھتے ہیں۔

چپ کے زندان سے لفظوں کو رہائی دوں گا

اتنا گونجوں گا کہ صدیوں کو سنائی دوں گا

اپنی موجودگی کھولوں گا کسی دن سب پر

وقت آئے گا تو دنیا کو دکھائی دوں گا

اک ذرا دیر مجھے شاہ سُخن ہونے دو

بھیک میں شہر کو لفظوں کی خدائی دوں گا(۳۸)

سماج میں ہونے والی ظلم و زیادتی پر تماشائی بن کر چُپ کا روزہ رکھنے والے اور ظلم زیادتی کے آگے سر جھکانے والوں کے رویے پر احسان شاہ نالاں ہے۔وہ لکھتے ہیں:

میں اپنی لاش پر ماتم کناں تھا شہر چُپ تھا

مرا سَر جب سرِ نوکِ سناں تھا شہر چُپ تھا

تماشائی نظارہ کر رہے تھے بے حسی سے

غریبِ شہر کا جلتا مکاں تھا شہر چُپ تھا(۳۹)

اکبر نحوی کا دکھ انسانیت کا دکھ ہے۔ وہ دنیا کی حقیقت، انسان کا مقام اور عروجِ آدم سے نہ صرف واقف ہے بلکہ ان مقامات کو پہچانتے بھی ہیں۔ اسی لیے انہوں نے اپنی شاعری میں ایک ماہر فن کار کی حیثیت سے شاعری کے جوہر دکھائے ہیں۔ نحوی سماج کے ہر منظر کی اس انداز میں تصویر کشی کرتے ہیں کہ ہر سننے والا اور دیکھنے والا متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کی شاعری میں واقعہ کربلا حق اور سچ کو پرکھنے کی ایک کسوٹی کے طور پر نظر آتا ہے۔ نحوی کی شاعری انقلابی شاعری ہے۔ وہ سماج میں انسانی رویوں کے خلاف آواز حق بلند کرنے سے گھبراتے نہیں:

یہ کون زندگی کے سفینے ڈبو گئے

صدیوں کے یار، پل میں عدو کیسے ہو گئے

جب شہر الوؤں کی زبان بولنے لگے

کلیوں کے قہقہے بھی سر شام سو گئے(۴۰)

معاشرے میں ہونے والی ظلم و زیادتی اور ناانصافی کے خلاف وہ یوں احتجاج کرتے ہیں:

مزدور خودکشی کی فصیلوں میں چھپ گئے

حکام گفتگوئے گرانی تک آ گئے

نحوی فضا کے زاغ وزغن حکمراں ہوئے

شاہین جب بھی زمزمہ خوانی تک آ گئے(۴۱)

گلگت کے اردو شاعری کی مزاحمتی باب میں عبدالحفیظ شاکرؔ بھی ایک توانا آواز ہے۔ وہ معاشرتی زندگی میں پائی جانے والی کج روی، بے سمتی، مرکز گریزی اور سماج کُش رویوں کے خلاف نہ صرف آواز بلند کرتے ہیں بلکہ ان کی اصلاح کے لیے بھی ایک مصلح کے طور پر سرگرم عمل رہتا ہے۔ عبدالحفیظ شاکرؔ اپنے دیس میں فرقہ پرستی اور تعصب کے عفریت کی وجہ سے پھیلنے والی بدامنی کی تصویر اپنی طویل نظم "کربلائے جدید" میں دکھا کر لوگوں کے ذہنوں کو یوں جھنجوڑتے ہیں:

نیا اک کربلا ہے شہر میں کیوں

سمائے بے نوا ہے شہر میں کیوں

اسی کا گھر جلا ہے شہر میں کیوں

یہ ماتم سا بپا ہے شہر میں کیوں(۴۲)

عبدالحفیظ شاکرؔ کی حاصلِ زیست پیار و محبت اور امن و آشتی ہے۔ وہ مذہبی منافرت، فرقہ پرستی، تعصبات اور معاشرتی ناہمواریوں سے نہ صرف نالاں نظر آتے ہیں بلکہ ان کے خلاف پوری قوت سے قلمی توانائیاں بھی صرف کر رہے ہیں۔ وہ نفرت کے قید خانوں سے نکل کا الفت کا سورج بن کر طلوع ہونا چاہتا ہے تاکہ مہر محبت سے سارا علاقہ روشن ہو۔ ان کی کتاب "زندگی" میں جابجا یہی مشاہدے نظر آتے ہیں:

الفتوں اور چاہتوں میں زندگی

اصل میں ہے قربتوں میں زندگی

خود بجھا کر امن کے سارے دیے

اب گزارو ظلمتوں میں زندگی(۴۳)

سماجی

مزاحمت کے حوالے سے نوجوان شاعر عبدالکریم کریمی بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ انہوں نے بھی سماجی شعور کو بروئے کار لاتے ہوئے معاشرے میں ہونے والے بدامنی، ظلم وزیادتی، ناانصافی، مذہبی تعصب اور شدت پسندی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ مذہبی منافرت کی وجہ پھیلنے والی بدامنی اور اس کے اثرات کو اپنی نظم "شہر گلگت" میں یوں بیان کرتے ہیں:

موت ہے رقصاں گلیوں اور بازاروں میں

ڈوب رہی ہے دھرتی خون کے دھاروں میں

جس کو دیکھو اک دوجے سے خائف ہے

اتنی نفرت کس نے بھر دی پیاروں میں

بسنے کو تو ہم بستے ہیں بستی میں

دیکھیں تو تقسیم ہیں ہم دیواروں میں

آدم زاد کو آدم زاد سے نفرت ہے

لوگ پناہیں ڈھونڈھ رہے ہیں غاروں میں(۴۴)

کریمی کا غم انسانیت کا غم ہے۔ وہ پرائی آگ میں اپنے جیسے انسانوں کو جلتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ علاقے میں منافرت کی اس آگ سے پھیلنے والی حبس اور گھٹن سے کریمی سخت کرب میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

خوف کے سائے یہاں ہیں دور تک پھیلے ہوئے

شہر بھی سہما ہوا ہے لوگ بھی سہمے ہوئے

ہم کہ ہیں نوحہ کناں حالات کی دہلیز پر

مسکراتے ہیں وہ جن کے ذہن ہیں سوئے ہوئے(۴۵)

الغرض مزاحمت کے سماجی رویوں کے ذیل میں گلگت کے اردو شعراء نے نہ صرف صدائے احتجاج بلند کی ہے بلکہ ان سماجی رویوں کو درست سمت میں لے جانے کے لیے بھی مثبت کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ گلگت کے اردو شاعری کی سماجی مزاحمت کی باب میں گلگت کے اردو شعراء کی کوششیں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ برچہ، شیر باز خان، تذکرہ اہلِ قلم و شعرائے گلگت، ایس ٹی پرنٹرز راولپنڈی، مارچ ۱۹۸۹، ص ۱۲۰

۲۔ ہارون رشید، حرف چند، مشمولہ: سروشِ ضیاء، ضیاء پبلی کیشنز گلگت، ۲۰۱۰ ص ۳

۳۔ برچہ، شیر باز خان، تذکرہ اہلِ قلم و شعرائے گلگت، ایس ٹی پرنٹرز راولپنڈی، مارچ ۱۹۸۹، ص ۱۲۳

۴۔ گلگت بلتستان کا اردو ادب (حصہ نثر)، حلقہ ارباب ذوق، ۲۰۱۱، ص ۶۱ / ۶۰

۵۔ تاج، عبد الخالق، غیر مطبوعہ کلام جو راقم کو بذریعہ واٹس ایپ موصول ہوا۔

۶۔ تاج، عبد الخالق: انتخاب گلگت بلتستان (سہ ماہی) شمارہ نمبر ۲، جلد نمبر ۱، یکم اکتوبر تا ۳۱ دسمبر ۲۰۰۲، ص ۱۵

۷۔ تاج، عبد الخالق، غیر مطبوعہ کلام جو راقم کو بذریعہ واٹس ایپ موصول ہوا۔

۸۔ دکھیؔ، جمشید خان: انتخاب گلگت بلتستان (سہ ماہی) شمارہ نمبر ۲، جلد نمبر ۱، یکم اکتوبر تا ۳۱ دسمبر ۲۰۰۲، ص، ۲۱

۹۔ دکھیؔ، جمشید خان: گلگت بلتستان کا اردو ادب (حصہ نظم)، حلقہ ارباب ذوق گلگت، ۲۰۱۱، ص ۱۶۴

۱۰۔ دکھیؔ، جمشید خان، گلگت بلتستان کا اردو ادب (حصہ نثر)، حلقہ ارباب ذوق گلگت، ۲۰۱۱ ص ۶۳

۱۱۔ طارقؔ، خوشی محمد، گلگت بلتستان کا مزاحمتی ادب، مشمولہ گلگت بلتستان کا اردو ادب (حصہ نثر)، ۲۰۱۱، ص ۶۵ / ۶۴

۱۲۔ ضیاء، محمد امین، سروشِ ضیاء، ضیاء پبلی کیشنز گلگت، ۲۰۱۰، ص ۷۵ / ۷۴

۱۳۔ ایضاً، ص ۵۸ / ۵۷

۱۴۔ ایضاً، ص ۸۱

۱۵۔ ایضاً، ص ۷۱ / ۷۰

۱۶۔ ایضاً، ص ۸۴

۱۷۔ طارق، خوشی محمد، پلکوں کے سائباں، ناشر: طارق سنز پشواڑی منی مرگ استور، ۱۹۹۷، ص ۵۸

۱۸۔ ایضاً، ص ۶۲

۱۹۔ ایضاً، ص ۷۶ / ۷۵

۲۰۔ طارقؔ، خوشی محمد، خواب کے زینے، ناشر: طارق سنز پشواڑی منی مرگ استور، ۲۰۰۰، ص ۵۷ / ۵۸

۲۱۔ مشتاق، حبیب الرحمٰن، ہوا نے چوڑیاں پہنی ہوئی ہے، ہنی سار پبلیشنگ نیٹ ورک گلگت، ۲۰۰۲، ص ۳۱

۲۲۔ ایضاً، ص ۸۸

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۱۱

۲۴۔ احسان شاہ، برف کے صحراؤں میں، ناشر: پاکستان فکری تحریک گلگت، ۱۹۹۹، ص ۱۳

۲۵۔ ایضاً، ص ۳۹

۲۶۔ ایضاً، ص ۴۶

۲۷۔ ایضاً، ص ۴۷

۲۸۔ نحویؔ، اکبر حسین، حرف رفو، ص ۲۰۱

۲۹۔ تاجؔ، عبدالخالق، غیر مطبوعہ کلام جو راقم کو بذریعہ واٹس ایپ موصول ہوا۔

۳۰۔ تاجؔ، عبدالخالق، غیر مطبوعہ کلام جو راقم کو بذریعہ واٹس ایپ موصول ہوا۔

۳۱۔ دکھیؔ، جمشید خان: انتخاب صباؔ نمبر، شمارہ نمبر ا، جلد نمبر ۲، اگست تا اکتوبر ۲۰۰۳، ص ۱۲۶

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۷۸

۳۳۔ ظفرؔ، ظفر وقار، آکاس، ناشر ندارد، جنوری ۱۹۹۲، ص ۲۸

۳۴۔ ظفرؔ، وقار ظفر، آنند، ہمالیہ پبلیشر انٹرنیشنل، جون ۱۹۹۸، ص ۸۵ / ۸۴

۳۵۔ ایضاً، ص ۱۱۹ / ۱۱۸

۳۶۔ مشتاق، حبیب الرحمٰن، کوئی موجود ہونا چاہتا ہے، ادبی انجمن فکری تحریک گلگت، ۲۰۱۲، ص ۱۹

۳۷۔ ایضاً، ص ۳۷

۳۸۔ احسان شاہ، مرا خواب زیرِ چراغ تھا، ہنی سار پبلیشر گلگت، ۲۰۰۵، ص ۹۸

۳۹۔ ایضاً، ص ۸۱

۴۰۔ نحویؔ، اکبر حسین، حرفِ رفو، الجواد پرنٹر راولپنڈی، ۲۰۱۶، ص ۱۰۸

۴۱۔ ایضاً، ۱۴۲

۴۲۔ شاکرؔ، عبدالحفیظ، میں نہیں ہوں، ناشر ندارد، ۲۰۰۸، ص ۸۳

۴۳۔ شاکرؔ، عبدالحفیظ، زندگی، گلگت ہنزہ پرنٹنگ پریس، ۲۰۱۷، ص ۴۷

۴۴۔ کریمیؔ، عبدالکریم، شائید پھر نہ ملیں ہم، کراچی زیڈ اے پرنٹنگ، ۲۰۰۸، ص ۴۷

۴۵۔ کریمیؔ، عبدالکریم، تیری یادیں، کاروان نگر غذر، ۲۰۱۱، ص ۷۸

باب سوم

بلتستان کے منتخب اردو شعراء کی شاعری میں مزاحمت کے سیاسی و سماجی زاویوں کا مطالعہ

الف۔ بلتستان کے اہم شعراء کا تعارف

راجہ محمد علی شاہ صباؔ

اماچہ خاندان کے چشم و چراغ راجہ محمد علی شاہ صباؔ ۳۱ جولائی ۱۹۶۴ کو ضلع شگر کے ہیڈ کوارٹر شگر خاص میں پیدا ہوئے۔(۱) راجہ صباؔ نے ابتدائی تعلیم شگر اور سکردو سے حاصل کی۔ ملازمت کا باقاعدہ سلسلہ ۱۹۴۸ کی جنگ آزادی کے دوران پاک فوج میں شامل ہو کر کیا۔ پاک فوج میں آٹھ سال خدمات سرانجام دینے کے بعد ۱۹۶۷ میں محکمہ مال سے وابستہ ہو کر مختلف انتظامی عہدوں پر فائز رہے۔ بعد ازاں مدت ملازمت مکمل ہونے کے بعد ۱۹۸۷ میں اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے سے سبکدوش ہو گئے۔ راجہ صباؔ نے شعر و سخن کا آغاز زمانہ طالب علمی سے کیا۔ اردو شاعری کا اصلاح سکردو میں ملازمت کی غرض سے مقیم جموں کے رہنے والے غلام عسکری سے لیتے تھے۔(۲)

راجہ صباؔ نے تمام
اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن غزل گوئی ان کا اصل میدان ہے۔ راجہ صباؔ کو اردو زبان کے علاوہ بلتی زبان کا قادرالکلام شاعر مانا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے علمی اور ادبی حلقوں میں آپ کو سرتاج ادب کا درجہ حاصل ہے۔ راجہ صباؔ فارسی زبان

میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔اس کے علاوہ نثر نگاری میں بھی پختگی رکھتے ہیں۔راجہ صباؔ شگری کی شاعری کم و بیش چالیس سال تک محیط ہونے کے باوجود اب تک کوئی شعری مجموعہ طباعت کے مراحل تک نہیں پہنچا۔تاہم آپ کی اہم تصانیف میں "بلتی اردو لغت"، "نقیب آزادی"، "گُلِ عباس" شامل ہیں۔

سید اسد زیدیؔ

سید اسدؔ شاہ زیدی

وادی کھرمنگ کے معروف سادات گھرانے میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم آبائی گاوں سے حاصل کی۔بعد ازاں گارڈن کالج لاہور سے بی۔اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔سید اسدؔ زیدی نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہوئے قانون کی ڈگری بھی حاصل کی۔اسد شاہ زیدی نے ملازمت کا آغاز بطور آفیسر محکمہ مال سے کیا۔

محکمہ مال

کی ملازمت کو خیر باد کہنے کے بعد آپ نے باقاعدہ طور پر ناردرن ایریا کونسل کے تحت ہونے والے الیکشن میں بطور قانون ساز ممبر حصہ لیا اور کامیاب ہوگئے۔ آپ کئی مرتبہ گلگت بلتستان قانون ساز اسمبلی کے ممبر رہے۔سید اسد شاہ زیدی بطور قانون دان وکالت کے پیشے سے بھی وابستہ رہے۔سید اسد زیدی سیاسیات، قانون، منطق، فلسفہ، مذہب خاص طور پر شعر و سخن کے استاد مانے جاتے تھے۔فارسی، اردو انگریزی اور بلتی زبانوں میں مکلم مہارت رکھتے تھے۔انگریزی اور اردو ادب پر دسترس ہونے کی وجہ سے تقریر و تحریر دونوں کے مرد میدان سمجھے جاتے تھے۔شاعری میں ان کا اصل میدان غزل گوئی تھا۔آپ کا اولین شعری مجموعہ "رنگِ شفق" کو بلتستان کا اولین اردو شعری مجموعہ مانا جاتا ہے(۳)

سید اسدؔ زیدی کو ۲۰۰۸ء میں گلگت کے مقام قاتلانہ حملے میں شہید کر دیے گئے۔دوران شہادت آپ گلگت بلتستان قانون ساز اسمبلی میں ڈپٹی سپیکر کے اہم عہدے پر فائز تھے۔

حشمت علی کمالؔ الہامی

حشمت علی کمالؔ الہامی ۱۸ اگست ۱۹۵۵ء کو سکردو کے نواحی گاؤں کوار دو میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے نانا شیخ محمد جو سے حاصل کی۔ گاؤں سے پرائمری کا امتحان پاس کرنے کے بعد دینی علوم کے حصول کے لیے ۱۹۶۷ء میں فیصل آباد گئے۔ وہاں مدرسہ سلطان المدارس میں ایک سال تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرسہ مشارع العلوم حیدرآباد سندھ میں داخل ہوگئے۔ اور کم و بیش پانچ سال تک اسی مدرسے میں دینی علوم حاصل کرتے رہے۔

۱۹۷۴ء میں مزید حصول تعلیم کی غرض سے آپ کراچی منتقل ہوگئے۔ وہاں جامعہ امامیہ سے درسِ نظامی کی سند حاصل کی۔ کراچی ہی سے آپ نے میٹرک، ایف۔اے، بی۔اے، ایم۔اے اردو، معارفِ اسلامیہ، فارسی اور عربی کے امتحانات پاس کیے۔ اسی دوران اردو لا کالج سے ایل ایل بی اور ہمدرد طبّیہ کالج سے فاضل طب و جراحت کی اسناد بھی حاصل کیں۔ کمالؔ الہامی نے ملازمت کا باقاعدہ آغاز انقلابِ ایران کے فوراً بعد خانہ فرہنگ کراچی میں لائبریرین کی حثیت سے کیا۔ بعد ازاں ایک سال تک ایرانی قونصلیٹ کراچی میں کام کرتے رہے۔ یکم نومبر ۱۹۸۶ء میں پبلک سروس کمیشن کے تحت اردو ادب کے لیکچرار بھرتی ہوئے۔ کم بیش چالیس سال تک آپ گلگت بلتستان کے مختلف کالجوں میں اردو ادب پڑھاتے رہے۔ کمالؔ الہامی نے نظم و نثر کی جملہ اقسام اور تمام اصناف ادب میں بیش بہا تخلیقات پیش کی ہیں۔ بلتی، اردو اور فارسی زبانوں پر قدرت حاصل ہونے کی وجہ سے تینوں زبانوں میں خوب اشعار کہتے رہے۔ مختلف اخبارات میں متفرق مضامین پر ان کے دو ہزاروں کالم چھپے ہیں۔ کمالؔ الہامی نے لاتعداد مضامین، بہت سارے مقالات اور کئی افسانے بھی لکھے ہیں۔ ان کا تحریر کردہ افسانہ "امن کی تلاش" ملکی اخبارات میں چھپ کر مقبول عام حاصل کر چکا ہے۔ کمالؔ الہامی گلگت بلتستان کے نمائندہ رسائل و جرائد ارضِ بلتستان، جلوہ شمال، معراجِ ادب، بلتستان کے سخنور، اور نگارشات بلتستان کے مدیر اعلیٰ رہ چکے ہیں۔ کمالؔ الہامی کو گلگت بلتستان کا پہلا رباعی گو شاعر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ ۵۳۴ رباعیات پر مشتمل ان کی کتاب "رباعیاتِ کمالؔ الہامی" اس سلسلے میں ان کی پہلی کاوش ہے۔ انہوں نے تین ہزار اشعار پر مشتمل بلتستان کا منظوم انسائیکلوپیڈیا بعنوان "مثنوی بلتستان نامہ" بھی لکھا۔ کمالؔ الہامی نے اصناف شاعری میں تمام اصناف پر طبع آزمائی کی۔ نظم معریٰ ان کا خاص میدان رہا۔ اس

کے علاوہ انہوں نے عربی، فارسی اور اردو کے مشہور شعراء کے مختلف اشعار کا بلتی زبان میں منظوم ترجمہ بھی کیا۔ کمالؔ الہامی کی صرف ایک تصنیف "رباعیات کمال الہامی" کے نام سے اب تک منظر عام پر آچکی ہے۔ درجن بھر سے زائد نثری کتابیں اور شعری مجموعے زیر ترتیب تھے۔ لیکن زندگی نے ان کے ساتھ وفا نہ کی۔ یوں یکم اگست ۲۰۲۰ء کو کورونا وباء سے جنگ لڑتے لڑتے خالق حقیقی سے جا ملے۔

غلام حسن حسنیؔ

غلام حسن حسنیؔ ۱۹۵۵ میں ضلع کھرمنگ کے مردم خیز سرزمین ،غندوس میں پیدا ہوے۔ ابتدائی تعلیم گاوں سے حاصل کی۔ حسنیؔ اوائل عمری میں والدین کے ہمراہ راولپنڈی منتقل ہوگئے۔ وہاں کچھ عرصہ کسی امیر زادے کے گھر میں بطور ملازم کام کرتے رہے۔ ملازمت سے تنگ آکر بڑی باجی کے ہاں لاہور چلے گئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایف۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد آبائی سرزمین بلتستان واپس آئے۔ یہاں سے آپ نے ملازمت کے ساتھ ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ دوران ملازمت بی۔ اے اور بی۔ ایڈ کی ڈگری بھی حاصل کرلی۔ حسن حسنیؔ نے اصناف سخن کے تمام اصناف میں طبع آزمائی کی۔ لیکن غزل ان کا اصل میدان ہے۔ آبائی سرزمین بلتستان واپسی کے فوراًبعد حسن حسنیؔ نے ادبی تنظیم حلقہ علم وادب کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اور اس ادبی تنظیم کے ذریعے ادب بلتستان کے خزاں رسیدہ چمن کی آبیاری شروع کردی۔ جلد حسنیؔ بلتستان میں شعراء کی ایک کھیپ تیار کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ حسنیؔ کی تعلیم وتربیت لاہور جیسے علمی شہر میں ہوئی تھی۔ پردیس کی آب وہوا اور لاہور کے ادبی ماحول نے ان کے اندر کے شاعر کو خوب ابھارا تھا۔ ملک کے کئی نامور شعراء کی صحبت میں رہنے کا موقعہ بھی میسر آیا تھا۔ یہی وجہ ہے جب حسنیؔ واپس سکردو منتقل ہوئے تو لوگوں نے انہیں ایک کامیاب شاعر کے طور پر دیکھا۔۔ غلام حسن حسنیؔ صرف شاعر اور نثر نگار ہی نہیں بلکہ ایک عہد کا نام ہے۔ انہوں نے ریڈیو پاکستان سکردو سے ایک عرصے تک صدا کاری کا جادو بھی جگاتے رہے۔ اس کے علاوہ ریڈیو پاکستان سکردو کے لیے مختلف ڈرامے، خاکے، فیچر، تقاریر اور دیگر مواد تحریر کیے۔ جو اب بھی ریڈیو پاکستان سکردو کی لائبریری کا حصہ ہیں۔

غلام حسن حسنیؔ شاعری کے علاوہ نثری ادب سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔یہی وجہ ہے یکے بعد دیگرے کئی نثری کتابیں تخلیق کر ڈالی۔ان کے افسانوں کا مجموعہ "پھول بنے انگارے"،سفر نامے کی دو کتابیں"کوہ ایلپس کے دامن میں" اور"سکردو سے کارگل تک"،ان کی خود نوشت "پنجرہ اور پھول" جبکہ "تم لو"(بلتی ضرب الامثال پر مشتمل کتاب)ان کی نثری کاوشوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ شعری مجموعوں میں ان کی بلتی غزلوں کا مجموعہ "خسمبی میلونگ" اور بلتی مراثی کا مجموعہ "چھمی بلٹن" کے نام سے شائع ہوئے ہیں جبکہ اردو شعری مجموعے زیر طبع ہیں۔ حسنیؔ کے قلم کی جولانیاں عروج پر تھیں۔لیکن کینسر جیسی جان لیوا بیماری کا آپ شکار ہوگئے۔یوں اس بیماری سے لڑتے لڑتے ۲۰۱۰ء میں انتقال کر گئے۔

احسان علی دانشؔ

احسان علی دانش ۱۹۶۸ میں سرمیک گاؤں میں پیدا ہوئے۔احسان علی دانشؔ نے ہائی سکول مہدی آباد سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد کراچی سے ایف۔اے اور بی۔اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔اسی دوران بلتستان میں سرکاری ملازمت بھی مل گئی۔کچھ عرصہ پبلک سکول اینڈ کالج سکردو میں بطور استاد طلباء کو اردو پڑھاتے رہے۔احسان علی دانش بلتی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کرتے ہیں۔ شعر و شاعری کے علاوہ نثر نگاری اور ترجمہ نگاری کے میدان میں بھی اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔احسان علی دانشؔ کو علمی و ادبی حلقوں میں ایک کامیاب شاعر کے ساتھ ایک معروف کمپیر کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ریڈیو پاکستان سکردو سے مختلف موضوعات پر اپنے فن کا جادو جگاتے رہتے ہیں۔احسان علی دانشؔ بلتستان کی معروف ادبی تنظیم بزمِ علم و فن سکردو کے نائب صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آپ کی اہم تصانیف میں درج ذیل کتابیں شامل ہیں: شکستہ ناؤ(شعری مجموعہ)، چلتے چلتے کافرستان میں (

سفر نامہ)، تیرے در پہ آیا ہوں (سفر نامہ)، امام خمینی کی برسی میں (سفر نامہ)، شمال کے ستارے (شخصی خاکے)، زبورِ شریف (بلتی ترجمہ)، علامہ اقبال کی منتخب نظمیں (منظوم بلتی ترجمہ) اور ساحلِ مراد (شعری مجموعہ)۔

محمد افضل روشؔ

محمد افضل

روش ۱۹۷۵ میں سکردو کے نواحی گاؤں وادی قمراہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم آبائی گاؤں سے حاصل کرنے کے بعد سکردو سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے فیصل آباد چلے گئے۔ وہاں جی۔ سی۔ ٹی سے آپ نے الیکٹریکل انجنیرنگ میں ڈپلومہ کی ڈگری حاصل کی۔ فیصل آباد میں قیام کے دوران وہاں کے معروف ادبی تنظیم افکار ادب سے منسلک رہے۔ بلتستان واپس آکر بطور سیکریٹری نشر و اشاعت بلتستان کی ادبی تنظیم بہار ادب سے منسلک ہو کر مختلف مشاعرے منعقد کرواتے رہے۔ افضل روشؔ کا اصل میدان نظم اور غزل ہے۔ تاہم آپ حمد، نعت، منقبت، سلام، نوحہ جیسے اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ افضل روشؔ کے ادبی کائنات میں ایک اردو شعری مجموعہ "درپا" اور بلتی زبان میں افسانوں کا مجموعہ "پھرتخ" شامل ہیں۔

ذیشانؔ مہدی

آپ کا اصل نام شبیر حسین

ہے۔ ادبی دنیا میں لوگ ذیشان مہدی کے نام سے جانتے ہیں۔ شبیر حسین المعروف ذیشان مہدی ۱۹۷۷ء کو سکردو کے قدیمی گاؤں نیو رنگاہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں نیو رنگاہ کا مقامی نام تبدیل کر کے قائد آباد رکھا گیا تھا۔ اس لیے اسی مناسبت سے ذیشان قائد آبادی کہلائے۔ لیکن جلد اس نام کو تبدیل کر کے ذیشان مہدی رکھا گیا اور علمی و ادبی حلقوں میں اسی نام سے مشہور ہو گئے۔ ذیشان مہدی نے ابتدائی تعلیم سکردو سے حاصل کی۔ بعد ازاں بی۔ اے کا امتحان اعلیٰ نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ ذیشان مہدی کو بچپن ہی سے لکھنے لکھانے کا شوق تھا۔ یہی شوق جنون آپ کو میدان شعر و سخن میں لے آئے۔ اگرچہ

ذیشانؔ مہدی کا اصل میدان اردو غزل ہے۔ لیکن بلتستان میں اردو رثائی ادب کو فروغ دینے میں بھی ان کا اہم کردار رہا ہے۔ ذیشان پیشے کے اعتبار سے صحافی ہے۔ اس لیے گلگت بلتستان کے عوامی مسائل کو ملکی سطح پر اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ وہ اس وقت پریس کلب سکردو کے صدر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

ذیشانؔ مہدی شعر و سخن اور سماجی سرگرمیوں سے جنون کی حد تک لگاو رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے سماجی اور ادبی سرگرمیوں کی ترویج کے لیے ۲۰۱۲ میں فکر سوشل فورم بلتستان کی بنیاد رکھی۔ اور اس تنظیم کی تاحیات بانی و چیرمین ہے۔

ذیشانؔ مہدی شاعری کے علاوہ ریڈیو میزبان کے طور پر بھی اہم مقام حاصل کر چکے ہیں۔ ریڈیو پاکستان سکردو اور ایف ۔ایم ریڈیو پر اپنے فن کا جادو جگا چکے ہیں۔ خاص کر ایف۔ ریڈیو سے نشر ہونے والا پروگرام "بزمِ شب" ہر خاص و عام میں شہرت حاص کر چکے ہیں۔ آپ کے شعری کائنات میں دو شعری مجموعے "درد کی پہلی دھوپ" اور "نئے خواب کی خواہش" شامل ہیں۔

عاشق حسین عاشقؔ

عاشق

حسین عاشقؔ ۱۹۸۳ میں تحصیل روندو میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ہائی سکول تھوار روندو سے حاصل کیا۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری سے شغف رکھتے تھے۔ یہی شوق سخن عاشق حسین عاشقؔ کو بہت جلد سکردو کی ادبی تنظیم بزم علم و فن سے وابستہ شعراء کی محفل تک پہنچا دیا۔ ان شعراء کی صحبت میں رہ کر عاشقؔ کو فن شعر و سخن کو مزید پروان چڑھانے کا موقعہ ملا۔ یوں عاشق حسین عاشق کو بہت جلد مقامی سطح پر ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی مل گئی۔ عاشق حسین عاشقؔ کا خاص میدان اردو غزل گوئی ہے۔ بلند خیالی، ندرت، تخیل اور زبان و بیان کی ندرت ان کی کلام کے نمایاں اوصاف ہیں۔ عاشق کا واحد شعری مجموعہ "گمشدہ خواب" کے عنوان سے چھپ کر علمی و ادبی حلقوں میں داد وصول کر چکے ہیں

محمد عباس سفیرؔ

محمد عباس سفیرؔ کا تعلق بلتستان کے خوب صورت علاقہ روندو گنجی سے ہے۔ آپ کی پیدائش ۲۱ فروری ۱۹۹۰ء کو بلتستان کے صدر مقام سکردو میں ہوئی۔ آپ کے والد گرامی جسٹس محمد نظیم کا شمار اپنے زمانے کے قابل ججوں میں ہوتا تھا۔عباس سفیرؔ نے ابتدائی تعلیم سکردو سے حاصل کی۔بعد ازاں اعلیٰ تعلیم کے لیے آپ کیڈٹ کالج سیالکوٹ میں داخل ہوگئے۔وہاں سے آپ نے مڈل، میٹرک اور ایف۔ایس۔سی کا امتحان امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔انٹر میڈیٹ کے بعد آپ نے پاکستان آرمی میں کمیشن حاصل کرنے کے لیے امتحان دیا جو پاس ہو گیا۔ مگر والدین کی طرف سے اجازت نہ ملنے پر آپ نے بی۔اے کا امتحان بطور پرائیوٹ امیدوار قراقرم انٹرنیشنل یونیورسٹی سے سن ۲۰۱۳ء میں پاس کیا۔اور بطور پرائیوٹ امیدوار گلگت بلتستان بھر میں پہلی پوزیشن حاصل کر کے ایک منفرد اعزاز اپنے نام کیا۔گریجویشن کے بعد آپ نے راولپنڈی لاکالج سے قانون کی ڈگری امتیازی نمبروں کے ساتھ حاصل کیا۔اس وقت آپ سکردو میں قانون کی پریکٹس کرنے کے ساتھ سیاست کے عملی میدان میں بھی مصروف عمل ہیں۔

عباس سفیرؔ کی اب تک
شاعری پر مشتمل تین کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ جن میں ایک انگریزی زبان میں جبکہ "سراب" اور "بانگِ صبحِ انقلاب" اردو کلام پر مشتمل کتاب ہیں۔

عباس سفیرؔ نظم اور غزل دونوں میں خوب لکھتے ہیں۔ان کی شاعری کا نمایاں پہلو انقلابی ہے۔وہ بطور سیاسی رہنما سیاسی سماجی مسائل پر آواز اٹھاتے رہے ہیں۔

میرؔ افتخار

میر

افتخار علی ۲۰ اگست ۱۹۸۱ء کو سکردو میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام افتخار علی ہے اور میرؔ بطور تخلص استعمال کرتے ہیں۔ آپ کے آباواجداد کا تعلق ضلع استور چلم سے ہے۔ جو کہ ۱۹۷۰ء کے عوائل میں ہجرت کر کے سکردو حاجی گام میں آبسے۔

میرؔ افتخار نے ابتدائی تعلیم

سکردو سے حاصل کیا۔ آپ نے میٹرک ۲۰۰۰ء میں ہائی سکول نمبر ا سے جبکہ انٹر میڈیٹ کا امتحان لاہور اسکالر کالج سے سن ۲۰۰۴ء میں کیا۔ اس کے بعد پنجاب لا کالج لاہور سے ۲۰۱۰ء میں قانون کی ڈگری امتیازی نمبروں کے ساتھ حاصل کی۔ قانون کی ڈگری لینے کے بعد آپ نے کچھ عرصہ لاہور سیشن کورٹ اور لاہور ڈسٹرک کورٹ میں پریکٹس کیا۔ اس کے بعد واپس آبائی وطن بلتستان چلے گئے۔ تب سے لے کر اب تک چیف کورٹ سکردو میں قانون کی پریکٹس کر رہے ہیں۔ ان کا شمار بلتستان کی چوٹی کے وکیلوں میں ہوتا ہے۔ میرؔ افتخار کی سیاسی وابستگی زمانہ طالب علمی سے پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ رہی۔ اس وقت آپ پی پی پی لائر فورم بلتستان ڈویژن کا جنرل سیکریٹری اور ڈسٹرکٹ بار کونسل سکردو کے صدر کی حیثیت سے خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔

میرؔ افتخار کو شاعری وراثت میں ملی۔ آپ کے دادمرحوم حاجی اخوند موسیٰ شیناز بان کے پہلے صوفی شاعر مانا جاتا ہے۔ ان کی منظوم مناجات پر مشتمل شاعری کی کتاب ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی تھی۔

میرؔ افتخار کو شعر و شاعری کا شغف بچپن سے ہی تھا۔ لاہور میں قیام کے دوران مطالعہ کتب اور لاہور کے ادبی فضا نے ان کے شعری رجحان کی خوب پرورش کی۔ وہ نظم اور غزل دونوں صنف سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ان کی شعری رجحان میں سیاسی اور انقلابی پہلو زیادہ نمایاں ہیں۔ اب تک "قلم سوزی ارمان" ان کی واحد شعری کائنات ہے۔

ب۔ بلتستان کی اردو شاعری میں مزاحمت کے سیاسی زاویے

شعر و ادب میں سیاست کا تذکرہ یا سیاست کا شاعری سے رشتہ زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ سیاسی حالات و واقعات میں رونما ہونے والی تبدیلی اور اتار چڑھاؤ ادیب اور قلم کار کے قوتِ فکر اور قلم کو طاقت بخشتا ہے۔

یوں کہہ سکتے ہیں کہ شعر و ادب میں سیاسی حالات و واقعات کا تذکرہ اور معاملات کی جھلک شعر و ادب کو نہ صرف عصری شعور عطا کرتا ہے بلکہ اپنے زمانے کی عکاس بنانے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

تاریخی حقائق کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بلتستان میں ۱۲۰۰ء میں مقامی راجاوں کا دور حکومت شروع ہوتا ہے۔جو تسلسل کے ساتھ جاری رہا۔ ۱۸۴۰ء میں سکردو پر مقپون حکمران احمد شاہ کی حکومت تھی۔ مقپون حکمران احمد شاہ نے بڑے بیٹے کی بجائے چھوٹے بیٹے کو ولی عہد نامزد کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے بڑے بیٹے کو اپنے والد سے شدید اختلاف پیدا ہو گئے تھے۔ان اختلاف کے پیش نظر احمد شاہ کے بڑے بیٹے نے جموں جا کر مہاراجہ گلاب سنگھ سے اپنی ولی عہدی کی بحالی کے لیے فوجی امداد طلب کی۔ اس درخواست پر ڈوگروں کی فوج بلتستان میں داخل ہوئیں۔یوں مقامی حکومت کو گرا کر ڈوگروں نے اپنی حکومت قائم کر دی۔ یہاں سے لے کر ۱۹۴۸ء تک اگرچہ ڈوگروں کے خلاف مقامی سطح پر مزاحمت ضرور ہوتی رہی مگر ڈوگروں نے اپنا پنجہ مضبوطی سے گاڑے رکھا۔

سن سینتالیس کے عوائل میں کشمیر کی طرح بلتستان کی سر زمین بھی غلامی کے گہرے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ تاہم یہاں کے عوام نے اپنی مدد آپ سر ہتھیلیوں پہ سجا لیے اور بھوکے ننگے رہ کر ڈوگرہ سامراج کے خلاف لڑے اور اس شان سے لڑے کہ غلامی کے اندھیروں کو نہ صرف خطہ گلگت بلتستان سے دور بھگا دیا۔ بلکہ زوجیلا اور کارگل کی ناقابل عبور بلندیوں کو روندتے ہوئے لداخ کی سنگلاخ وادیوں تک جا پہنچے۔

یوں ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو بلتستان میں کامیاب جنگ آزادی کے بعد ڈوگروں کی تسلط ختم کر کے علاقے کو پاکستان کے زیرِ انتظام کر دیا گیا۔تب سے لے آج تک یعنی چوہتر سال گزرنے کے باوجود گلگت بلتستان کے سیاسی مستقبل کا آج تک فیصلہ نہیں ہو سکا۔ اور اس علاقے کو آج بھی متنازعہ حیثیت میں رکھا گیا ہے۔

کسی بھی شاعر، ادیب، تخلیق کار یا فنکار کا اگر نظریاتی بنیاد مضبوط ہو تو دنیا کی کوئی طاقت اس شاعر یا تخلیق کار کو اس کے راستے سے لاکھوں جتن کے باوجود نہیں ہٹا سکتی۔ سچ کا راستہ انتہائی مشکل راستہ ہوتا ہے۔ اس راستے خطروں سے کھیلنے والے ، عزم و حوصلے سے کام لینے والے ، دار و رسن اور صعوبتوں کو برداشت کرنے والے سر پھروں کے ہی قدم اٹھتے ہیں۔ کیونکہ ان کا نظریہ زندگی عوامی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔

سید اسدؔ زیدی کا شمار گلگت بلتستان کے ان چنیدہ شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی زندگی سیاسی اور سماجی سطح پر انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دیا۔ اسدؔ زیدی خود ایک منجھے ہوئے سیاست دان تھا۔ اس لیے ہمیشہ ظلم و جبر اور استحصالی قوتوں کے خلاف آواز حق بلند کرتے رہے۔ ان کا نظریہ زندگی چونکہ انسانیت اور انسانیت کی بقا ہے۔ لہذا وہ جابر، قابض اور استحصالی قوتوں کے سامنے سینہ سپر ہو کر اپنے نظریہ فن کی یوں وضاحت کرتے ہیں:

تم جفا اور کرو ہم پہ ستم اور کرو

سرِ عُشاق سرِ راہ قلم اور کرو

تھم سکے گا نہ بغاوت کا ابھرتا سیلاب

اور بڑھ جائے گا طوفان جو کم اور کرو

عہد جمہور میں آئین کُہن کیا معنی

انہی بیمار روایات کا غم اور کرو

ظلم کو ظلم جو کہدوں تو خفا ہوتے ہو

بندہ پرور یہ کرم ہے تو کرم اور کرو(۴)

کسی بھی ملک اور قوم کی ترقی کی رفتار کو روکنے کے لیے سرمایہ دارنہ نظام زہرِ ہلاہل سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ دنیا میں زیادہ تر مسائل اسی سرمایہ دارنہ نظام کی پیداوار ہے۔ اور سیاسی نظام انصاف کا مستحکم نہ ہونا ہے۔ گلگت بلتستان کے وسائل پر مکمل کنٹرول وفاق پاکستان کا ہے۔ یہاں کے لوگوں کے مستقبل کا فیصلہ بھی وفاق اپنی مرضی سے کرتے چلے آئے ہیں۔ لیکن جب آئینی حیثیت کی بات کی جاتی ہے تو متنازعہ علاقہ کہہ کر بات ختم کی جاتی ہے۔ یوں گلگت بلتستان کے عوامی وسائل پر بھی سرمایہ دار قابض ہیں۔ سید اسدؔ زیدی نے رنگ شفق میں شامل ایک طویل غزل میں سرمایہ دارنہ نظام کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ جو معاشرے میں مساوات اور عدل انصاف کی رگوں کو کاٹنے میں مصروف ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

جب سے یہ آیا زمانے پر مظالم چھا گئے

ہے ستم کی ابتدا و انتہا سرمایہ دار

دشمن جمہوریت ہے، دشمنِ انسانیت

ہے ملوکیت کا واحد آسرا سرمایہ دار

اہل زر کے واسطے اک کھیل ہے یہ انتخاب

ووٹ ملتے ہیں اُسے، جس کا ہوا سرمایہ دار (۵)

سید اسدؔ زیدی کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ مغربی نظریات سے بھی آشنا تھے۔ اس لیے وسیع مطالعہ کی بنیاد پر ان کے خیالات کو جلا ملی۔ انہوں نے ذاتی مفادات کو کہیں سامنے نہ رکھا۔ دن کو ہمیشہ دن اور رات کو ہمیشہ رات ہی لکھا۔ شاہوں کی قصیدہ گوئی اور مدح سرائی کی بجائے، اپنی شاعری کے ذریعے عوامی جذبات کی ترجمانی کی۔

جاگیر داروں اور سرمایہ داروں کے مفادات کے تحفظ کی بجائے کسانوں اور مزدوروں کی حقوق کے لیے آواز بلند کرتے رہے۔

زندگی کو جاننے، حالات کو پہچاننے کا شعور اور ادراک حاصل کرنے کی کوشش میں ہر تخلیق کار سرگرداں رہتا ہے۔ لیکن زمانے کی مزاج دانی اور ماحول کو سمجھ کر ایک نئے سانچے میں ڈھال کر بیان کرنے کی کوشش پروفیسر کمالؔ الہامی کے ہاں نمایاں ہیں۔

کمالؔ الہامی اگرچہ موضوعاتی شاعری لکھنے میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ لیکن مزاحمتی شاعری کی باب میں ان کی شہرہ آفاق نظم "شہر نامہ" کو اولیت حاصل ہے۔ شہر نامہ چالیس اشعار پر مشتمل ایک طویل نظم ہے۔ جس میں انہوں نے معاشرے میں سیاسی حالت، عدم انصاف، مذہبی ملاؤں کی حالت اور شاعر اور قلم کی اہمیت کو بیان کرنے کوشش کی ہے۔ شہر نامہ سے نمونے کے اشعار ملاحظہ ہو:

رہنما تو تھے بہت، رستے میں ہر سو رہبری
کارواں سارا نہ جانے کیوں لٹا ہے شہر میں

پیچھے پیچھے میکدے میں مے کشوں کا پیر ہے
آگے آگے قوم کا وہ رہنما ہے شہر میں

محتسب کیسے کرے گا مجرموں کا احتساب
اس کے اپنے جرم سے پردہ ہٹا ہے شہر میں

کہہ رہے ہیں عندلیبوں کا نہیں ہے یہ چمن
گھونسلا کوؤں کا پھولوں پر بنا ہے شہر میں

اڑتی پھرتی ہیں خلا میں ننھی ننھی چونٹیاں
پر کٹا شاہین تو بیٹھا ہوا ہے شہر میں

اسپ تازی سے اتارا شہسواروں کو یہاں

دشت کا خرکار گھوڑے پر چڑھا ہے شہر میں(۶)

بظاہر تو راہنمائی کا راگ الاپنے والے لوگ نظر آئیں گے۔ مگر قوم سے مخلصی ان میں سے ہر ایک میں ناپید ہے۔ کمالؔ الہامی اپنے مزاحمتی انداز میں ان رہنماؤں پر تنقید کرتے ہیں جو پردے کے پیچھے رندوں اور پردے کے باہر زاہدوں کے بھیس میں ملتے ہیں۔ پیٹھ پیچھے ان کے تعلقات قوم کو لوٹ کر کھانے والے رہزنون سے ہوتے ہیں۔ جبکہ عوامی اجتماع میں آکر یہ منافق انہی دوستوں پر ہنستے ہوئے اندر سے برس پڑتے ہیں۔ کمالؔ الہامی انہی رہنماؤں کی منافقانہ روش کو قوم کے سامنے بے نقاب کرتے ہوئے ان کو باخبر کر رہے ہیں کہ اگر ایسے رہنماؤں کو سامنے لاتے رہیں گے تو ہمارا قافلہ بھی اسی طرح لٹتا رہے گا ۔اس لیے نئے ایسے رہنماؤں کو تلاش کیجیے جو اس قافلے کو اس منزل تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

انصاف کی جن کرسیوں پر دھونس دھاندلی اور میرٹ کی پامالی کرتے ہوئے جن لوگوں کو بٹھایا جاتا ہے۔ یہ تو وہی لوگ ہیں جن کا تو خود احتساب ہونا چاہیے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم انصاف کے ان ایوانوں کی زنجیریں ہلا کر مجرموں کے احتساب کا مطالبہ کر رہے ہیں ۔ناانصافی اور ظلم کی انتہا دیکھیے کہ عندلیبوں کو پھولوں سے اٹھا کر کوؤں کو بٹھا دیا گیا ہے۔ شاہنیوں کے پر کاٹ کر اڑ نہ سکنے والی چونٹیوں کو پروں سے نوازا گیا ہے۔ اور اسپ تازی جیسے اعلیٰ نسل کے گھوڑوں پر گدھوں کو چرانے والے خرکاروں کو سوار کر دیا گیا ہے۔ جس کی بنیاد ظلم و جبر پر ہو ایسے میں انصاف کہاں؟؟

رباعیات کمالؔ الہامی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے رباعیات کے ذریعے بھی سیاسی نظام ،جمہوریت، جمہوری نظام، حکومت اور تخت تاج اور سرمایہ دارنہ نظام کے خلاف بھی احتجاج کی ہے۔ رباعیات کمالؔ الہامی اگرچہ مختلف موضوعات پر مشتمل رباعیات کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں مزاحمتی عناصر جابجا نظر آتے ہیں۔ اسی سے کمالؔ الہامی کے شعور کی پختگی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

بلتستان کے اردو شعراء میں غلام حسن حسنیؔ کو صفِ اول کے شعراء میں شمار اجاتا ہے۔ مزاحمتی شاعری کے حوالے سے انھیں بلتستان کی اردو شاعری میں اہم مقام حاصل ہے۔ غلام حسن حسنیؔ جبر و استبداد اور ظلم و ناانصافی کے حوالے سے

اپنے قلم کے ذریعے جہاد کرتے رہے۔ ان کی آواز میں بلا شک و شبہ گلگت بلتستان کے محکوم اور محروم لوگوں کی آواز شامل ہو گئی تھی۔ اگرچہ اسی مزاحمتی رویے کی وجہ سے ان کی ذاتی زندگی کافی مسائل کا شکار رہی۔ ان کو ادبی محفلوں سے دور رکھا گیا۔ ان کی بنائی ہوئی تنظیم "بہارِ ادب" کو چلنے نہیں دیا گیا۔ ان کے اطراف سے شعراء کو اٹھا کر مختلف دھڑوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ لیکن ان تمام تر محرومیوں اور تکلیفوں کے باوجود انہوں نے ظلم و جبر کے خلاف مزاحمت کی مشعل کو اپنے اپنے سینے میں روشن رکھا۔

ہمارے معاشرے میں کئی سیاسی کردار ایسے ہیں جو عوامی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو عوام کے سامنے رہنما بنا کر پیش کرتے ہیں۔ لیکن اقتدار ملنے کے بعد عوام کے دکھ درد کو فراموش کر کے موقع دیکھ کر ان کے حقوق پر ڈھاکہ ڈالنے سے نہیں کتراتے۔ ایسے سیاسی مداریوں کے خلاف غلام حسن حسنیؔ یوں احتجاج کرتے ہیں:

تیرے کردار کی عظمت کا خدا خیر کرے

جھوٹ بھی ہو گیا شامل تری سچائی میں

معاف تاریخ کرے گی تمہیں کیا آئندہ؟

عافیت ڈھونڈنے والو کہو پسپائی میں

گالیاں دیتے ہوئے پیٹھ کے بل مت بھاگو

بزدلو دیکھنا گر جاؤ گے تم کھائی میں

نہیں معلوم ضمیروں کے خریداروں کو

لوگ ایسے بھی ہیں جو بِک گئے اک پانی(۷)

غلام حسن حسنیؔ جابر، ظالم طاقتوں کے تابع حکمران بن کر اپنے مظلوم عوام پر ظلم روا رکھنے والوں کے خلاف بھی آواز بلند کرتے رہے۔ وہ اپنی شاعری میں پوری توانائی اور سچائی کے ساتھ مزاحمت کرتے رہے۔ حسنیؔ نظریے کا شاعر ہے۔ وہ انسانی قدروں کی پامالی کو کبھی برداشت نہیں کرتے۔ اس لیے پِسے ہوئے محروم طبقے کی آواز بن کر لوگوں کو ظالم کے خلاف ڈٹ جانے کی تعلیم دیتے ہیں۔ وہ کسی طور جبر و استبداد کے سامنے سر جھکانے کو تیار نہیں۔ اپنے اصولوں سے سمجھوتہ کرنا ان کے نزدیک ہیچ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

ثابت قدم رہے جو اصولوں پہ ڈٹ گئے

دیکھو پہاڑ ظلم کے تھرا کے ہٹ گئے

آزادی ضمیر کے راہوں میں جان دو

جس طرح دار پر مرے مقبول بٹ گئے

سچ بات جب زبان پہ لانا شروع کیا

تب زندگی کے شہر میں اپنوں سے کٹ گئے(۸)

غلام حسن حسنیؔ کی سخن گوئی اور سخن شناسی کے کئی پہلو ہیں۔ حسنیؔ گلگت بلتستان کی اردو شاعری میں اپنے کلام کی رومانوی حسیت، کلاسیکی رچاؤ، اور منفرد لب و لہجے کے تیکھے پن سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں عشق و عاشقی کی گداختگی اور کرختگی کے ساتھ عہد و پیمانِ وفا کی محکمی بھی شد و مد کے ساتھ موجود ہیں۔ جو انھوں نے پِسے ہوئے اور کچلے ہوئے محروم طبقے کے مقدر سے باندھا تھا۔ ان کی شاعری میں بے شمار طنز کی کاٹ، شاعری کی تخلیقی ذہانت اور تہذیبی شعور کے عناصر موجود ہیں۔

ذیشانؔ مہدی کا شمار بلتستان کے سینئر شعراء میں ہوتا ہے۔ ذیشان کا شعری سفر ان کی پہلی کتاب "درد کی پہلی دھوپ" سے ہوتا ہے۔ جو کہ پہلی بار ۱۹۹۹ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کے بعد ان کی دوسری کتاب "نئے خواب کی خواہش" ۲۰۰۶ء

میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ اگر چہ ان دونوں کتابوں میں شامل غزلیں شاعر کی ایامِ شباب پر مشتمل شاعری ہے۔ لہذا رومانیت کا غلبہ زیادہ ہے۔ مگر ذیشان نوجوان ہونے کے باوجود سماجی شعور بہت پختہ ہے۔ ان کی دونوں کتابوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں بھی ہر حوالے سے مزاحمتی عناصر اور رویے موجود ہیں۔ وہ ایوان اقتدار میں خواب خرگوش کے مزے لینے والے غافل حکمرانوں کو جو اسلام اور اسلامی اصولوں سے نابلد ہیں، گلگت بلتستان کی آئینی حیثیت کے حوالے سے خبر دار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اسلام کو پہچانا ہی نہیں، قرآن کو وہ سمجھے ہی نہیں

ایوان میں اٹھ اٹھ کر اکثر جو دین کی باتیں کرتے ہیں

اربابِ سیاست !ہوش کرو اک لاوہ پھٹنے والا ہے

دیکھو تو یہاں کے بچے بھی آئین کی باتیں کرتے ہیں(۹)

ذیشانؔ مہدی پیشے کے اعتبار سے ایک قابل صحافی بھی ہے۔ اس خطے کی آئینی، سیاسی حیثیت اور علاقے کے مسائل کا انھیں خوب ادارک ہے۔ رومان پسند نوجوان شاعر ہونے کے باوجود گلگت بلتستان کے عوام کی احساس محرومی سے وہ چشم پوشی نہیں کرتے۔ انہی محرومیوں کا وہ یوں تذکرہ کرتے ہیں:

ماضی کے سارے درد پرانے ہوئے ہیں اب

مانگیں گے بیوفا سے جفائیں جدید ہم

ہم تو کفن پہن چکے مرنے کے واسطے

اور وہ سمجھ رہے ہیں منائیں گے عید ہم(۱۰)

اسی طرح گلگت بلتستان کے لوگوں کی احساس محرومی کو ایک اور جگہ یوں لکھتے ہیں:

ستاون سال سے روشن ہے آزادی کا سورج

مگر اس قوم کی قسمت میں ظلمت اب بھی پاتی ہے(۱۱)

ذیشان کی دوسری کتاب یعنی "نئے خواب کی خواہش" کے بعد کی شاعری کا مطالعہ کریں تو سیاسی اور سماجی حوالے سے مزاحمت زیادہ نظر آئیں گے۔ اس عرصے میں شاعر کا تخلیقی اور سماجی شعور بھی کافی پختہ صورت میں نظر آئیں گے۔ ۱۳ دسمبر ۲۰۲۰ء کو معرکہ پدم کے ہیرو محمد امین سندوس کی وفات پر ذیشان نے ایک طویل نظم لکھی۔ نظم میں شاعر مخاطب تو پدم کے ہیرو محمد امین سندوس سے ہے۔ لیکن دراصل یہ نظم آئین سے محروم سرزمین بے آئین کے باسیوں کا نوحہ ہے۔

پدم کے ہیرو!
تری جدائی پہ یاد آیا
کہ وہ لڑائی
جو تو نے اِس سرزمیں کی خاطر
کبھی لڑی تھی
وہ تیری اولاد لڑ رہی ہے
وہ تیرے احباب لڑ رہے ہیں
عجیب حالت ہے مدتوں سے
کہ تو نے دشمن سے جنگ کی تھی
ترے قبیلے کی
جنگ جاری ہے دوستوں سے
پدم کے ہیرو

تری جدائی پہ یاد آیا۔۔۔(۱۲)

محمد افضل روشؔ کا تعلق بھی بلتستان کے سینیر شعراء میں ہوتا ہے۔انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر اپنے لیے جو راستہ اپنایا ہے۔وہ راستہ ان کو ایک تابناک مستقبل کی طرف لے جائے گا۔افضل روشؔ کی تخلیقی سفر کی یہ روداد ایک آفاقی رنگ لیے ہوئے ہیں۔اس خارزار حیات کا ہر آبلہ پا مسافر اس درد کو محسوس کر سکتا ہے۔

اردو کے کلاسیکی شعراء نے اردو غزل میں عشق مجازی کے حوالے سے کوئی گنجائش باقی نہیں رہنے دیا۔یہی وجہ ہے ان استاد شعراء کی پیروی کرنے والے شعراء رومانی غزل میں کوئی خاص اضافہ نہ کر سکے۔افضل روشؔ کا یہ اختصاص ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو اردو کلاسیکی غزل کے حصار میں مقیّد ہونے سے باز رکھا۔

افضل روشؔ بنیادی طور پر نظریاتی شاعر ہے۔وہ نظریاتی طور پر ترقی پسند شاعر ہے۔انہوں نے ترقی پسند فکر کو جس فکری اخلاص ، سچائی اور صداقت سے اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے وہ فن انہی سے مخصوص ہے۔اسی بنا پر انہیں بلتستان کے اردو شعراء میں غلام حسن حسنیؔ کے بعد صفِ اول کے مزاحمت نگاروں میں شامل کیا جاتا ہے۔انھوں نے مزاحمتی شاعری میں بھی اپنے اسلوب کو روا رکھا۔انہوں نے جو نظمیں اور غزلیں کہی ہیں وہ گلگت بلتستان کی اردو شاعری میں مزاحمتی شاعری کے شہکار ہیں۔روشؔ کی شاعری ایک حساس اور دردمند دل کی شاعری ہے اور مظلوم و بے بس انسانوں کی صدائے احتجاج بھی۔

ہم کو بتا رہی ہے یہ محرومی حقوق

حالات ہو گئے ہیں بغاقت کو ساز گار

دنیا جو آ رہی ہے سیاحت کے نام پر

ہر گز نہیں یہاں کی روایت کو ساز گار(۱۳)

گردن میں سد اطوق غلامی کو سجا کر

آزادی کا سب جشن منانے چلے آئے

احساس نہیں حاکم دوراں کو ہمارا

یہ بات تمہیں آج بتانے چلے آئے

ہے کوئی زمانے میں روشؔ ثانی انچن

سکر دو سے جو غاصب کو بھگانے چلے آئے(۱۴)

اہل سیاست ویسے تو عوامی اجتماعات میں عوام کی فلاح و بہبود کی بات کرتے ہیں۔ غریبوں کو ان کا چھینا ہوا حق دلانے کی بات کرتے ہیں۔ لیکن جب اقتدار کی کرسی مل جاتی ہے تو سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اور ان کا مطمع نظر صرف اقتدار کی کرسی کو بچانا ہوتا ہے۔ روشؔ سیاسی مداریوں کی اسی منافقانہ روش سے یوں پردہ ہٹاتے ہیں:

بے یقینی کی فضا میں سانس لے سکتا نہیں

اب سرِ بازار یہ کھل کر بتانا چاہیے

بے ضمیروں کا ہمیشہ سے رہا ہے یہ خیال

قوم جائے بھاڑ میں عہدہ بچانا چاہیے(۱۵)

افضل روشؔ کی تمام تر شاعری کرب والم کی غمازی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ روشؔ کا خاص امتیاز ہے کہ ان کی کہی ہوئی بات جو بھی سنتا ہے اسی کی داستان معلوم ہوتی ہے۔

عاشق حسین عاشقؔ بلتستان کے نوجوان شعراء کی صفوں میں ایک توانا آواز ہے۔ عاشقؔ کی شاعری میں رومانوی رنگ نمایاں ہونے کے ساتھ فطری جوہر اور کلاسیکی انداز بھی ملتا ہے۔ لیکن ان کی شاعری حریت پسندی اور انقلابی فکر سے خالی بھی نہیں۔

وطن اور اہل وطن سے محبت اور قلبی لگاؤ عاشق حسین عاشقؔ کا امتیازی وصف ہے۔ "گمشدہ خواب" عاشقؔ کا واحد شعری کائنات ہے۔ "گمشدہ خواب" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عاشق حسین عاشقؔ نے ہر ظالم و جابر، سفاک موذی و مکار استحصالی عناصر کے مکر کی چالوں کو ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ اور ہر ظالم اور جابر کے ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا اور ظالم پر حرفِ ملامت بھیجنا وہ اپنا فرض عین سمجھتے ہیں۔ عاشقؔ پسے ہوئے طبقے کی نمائندگی کرتے ہوئے خوابِ خرگوش کی نیند سونے والے حکمرانوں کی ضمیر کو یوں جنجھوڑتے ہیں:

عدل کے ایوانوں پر اب ظلمتوں کا راج ہے

خوف آتا ہے مجھے اب قوم کے انجام سے

نفرتوں کی آگ میں لوگوں کی نسلیں جل گئیں

حکمراں سوتے رہے اس دیس کی آرام سے(۱۶)

ہمارے ملک میں سیاسی اور جمہوری نظام مضبوط نہ ہونے کی وجہ سے چور، ڈاکو، لٹیرے اور نااہل لوگ باری باری عوام پر حکمرانی کرتے رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے مظلوم اور محکوم لوگوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔ عاشق حسین عاشقؔ اسی حقیقت کی جانب یوں اشارہ کرتے ہیں:

محبت بانٹنے والے ہیں، غداری نہیں آتی

صداکاری تو آتی ہے اداکاری نہیں آتی

ہم اکثر سوچتے ہیں سوچ کر حیران ہوتے ہیں

ہمارے دیس میں اچھوں کی کیوں باری نہیں آتی(۱۷)

عباس سفیرؔ بلتستان کی اردو شاعری میں ایک منفرد اور نئی آواز ہے۔ اب تک ان کے دو شعری مجموعے منظر عام پر آئے ہیں۔ "سراب" سے شروع ہونے والا شعری سفر "بانگِ صبحِ انقلاب" تک آتے آتے جبر و ظلمت کی سیاہی کے خلاف ایک توانا آواز بن کر ابھرا ہے۔ عباس سفیرؔ خود ایک ماہر قانون دان اور زیرک نوجوان سیاسی رہنما ہے۔ اس لیے ان کی شاعری میں ترقی پسند سوچ کا غلبہ زیادہ ہے۔ مادری دور کی اس لعنتوں کے گرداب میں پھنس کر آج کے انسان پر بہت کڑا وقت آگیا ہے۔ ظلمت اپنے آپ کو ضیاء کہلانے پر بضد اور ہر سو بندے خدا بنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ وعدہ معاف سیاسی مداریوں نے اقدار و اخلاق کو پامال کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

عباس سفیرؔ کی شاعری عصری شعور اور آگہی سے بھرپور شاعری ہے۔ سفیرؔ جس بے کلی کا شکار ہیں اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ سیاسی مداری اور ٹھگوں کے ٹولے انسانوں کی متاعِ حیات لوٹنے میں مصروف عمل ہیں۔ اب محکوموں اور مظلوموں کے پاس صرف تن کی گٹھڑی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ گھر، دہلیز اور بنیادی حقوق سے محروم فاقہ کش سانس گن گن کر زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ گھٹن کے اس ماحول میں عباس سفیرؔ کی شاعری ایسے منظر نامے دکھاتی ہے جسے پڑھ کر قاری لرز اٹھتا ہے۔ اور ان کا دردمندانہ لب و لہجہ قاری کی نس نس میں سرائیت کر جاتا ہے۔ وہ آزادی اظہارِ رائے پر قدغن لگانے والوں کے خلاف یوں احتجاج کرتے ہیں:

یا مری سوچ کو پابندِ سلاسل کر دیں

یا مرے نطق پہ زنجیر لگائی جائے

"شخص باغی ہے زمانے کی کہن رسموں سے"

میرے ماتھے پہ یہ تحریر لگائی جائے

ہاں میں مجرم ہوں، اگر جرم ہے حق گوئی سفیرؔ

جرمِ حق ہے مرا، تعزیر لگائی جائے(۱۸)

عباس سفیرؔ کا دکھ یہ ہے کہ سیاست کی نیرنگیوں کے باعث منزلوں پر ان لوگوں نے غاصبانہ اور جابرانہ قبضہ کر رکھا ہے جو سرے سے شریکِ سفر ہی نہ تھے۔ جس معاشرے میں جاہل اپنی جہالت پر نازاں ہو، اہلیت رکھنے والے اور قابلیت رکھنے والوں کو موقعہ ہی نہ دیا جائے ایسے معاشرے میں ترقی اور تبدیلی ممکن نہیں۔ عباس سفیرؔ انہی جابر اور قابض ٹولے کے خلاف اپنی نظم "انقلاب آتا ہے" میں یوں لکھتے ہیں:

یہ چند لوگ نہیں جانتے کہ جب غربت

حیات و عزت و غیرت کا منہ چڑاتی ہے

تب ایک لاوا ابلنے کی حد کو آتا ہے

جو پھٹ کے سامنے ہر چیز کو مٹاتا ہے

ہر ایک قصر کی دیوار کو گراتا ہے

غرور و نخوتِ شاہی کا سر جھکاتا ہے(۱۹)

عباس سفیرؔ کی کتاب بانگِ صبحِ انقلاب میں شامل زیادہ تر نظمیں اور غزلیں مزاحمتی رنگ لیے ہوئے ہیں۔

میر افتخار علی کا شمار بلتستان کے نوجوان شعراء میں ہوتا ہے۔ پیشے کے اعتبار سے ماہر قانون دان ہونے کی وجہ سے سیاسی و سماجی ناانصافیوں کا قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ ان کی شاعری محکوموں اور مظلموں کی آواز ہے۔

میرؔ افتخار کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں ترقی پسندانہ سوچ، سیاسی شعور اور عصری شعور و آگہی زیادہ ہیں۔ ترقی پسندانہ سوچ اور نظریات ہونے کی وجہ انہوں نے شاعری کو انسانی وسائل سے جوڑ دیا ہے۔ یہ ان کا خاص طرہ امتیاز ہے۔

میرؔ افتخار جہاں رومانوی شاعری لکھتے ہیں وہیں سنجیدہ اور انقلابی شاعری میں بھی اپنا ایک منفرد مقام اور طرزِ تکلم رکھتے ہیں۔ ان کی مزاحمتی شاعری باغیانہ لہجہ لیے ہوئے ہیں۔وہ اپنی نظم "اپ رائزنگ "میں آمروں، جابروں اور قابض حکمرانوں کے خلاف عوام کو یوں جگاتے ہیں:

اٹھو کہ اپنی جبیں کب تلک جھکے یوں ہی؟

کبھی فصیلِ شہنشاہ کی نمو کے لیے

کبھی خدائے مذاہب کی آبرو کے لیے

کبھی تبرکِ جنت کے کارسازوں کی

تجارتِ بم و بارود کی نمائش کو

اٹھو کہ اپنی جبیں اس قدر کہ عام نہیں

جھکے جو بوٹ کی ٹھاپوں کے زور کے آگے

اٹھو کہ ایسے سپاہی کو ٹھوکریں ماریں

جو اپنی قوم پہ شب خون مارتا رہتا ہے(۲۰)

بلتستان کی اردو شاعری کا اگر سیاسی مزاحمتی رویے کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بلتستان کی اردو شاعری میں ضمیر اور اظہار کی آزادی، حریتِ فکر کی پاسداری، حرمتِ قلم، انسان اور انسانی مقام اور انسانی حقوق کے تحفظ کا مقام بہت بلند ہیں۔بلتستان کے شعراء نے حق و ناحق، انصاف اور ناانصافی کے درمیان تضاد اور کشمکش میں ایک سچے فنکار اور قلم کار کی حیثیت سے آگے بڑھ کر اپنی ذمہ داریوں کو اجاگر کیا ہے۔

بلتستان کی اردو شاعری کے فنی، فکری اور جمالیاتی پہلوؤں کے حوالے سے علمی مطالعہ اور تجزیہ آنے والے دور میں ضرور ہو گا۔ لیکن بلتستان کی اردو شاعری کی کسی ایک پیغام کی بات کی جائے تو وہ انسانی ہمدردی سے جڑے تخلیق کار کا سیاسی اور سماجی حقِ مزاحمت اور احتجاج ہے کہ اس کے بغیر ایک تخلیق کار کا انسان کے مقدر سے کوئی رشتہ قائم کرنے سے قاصر رہتا ہے۔

ج۔ بلتستان کی اردو شاعری میں مزاحمت کے سماجی زاویے

مزاحمت

انسان کی خمیر میں شامل ہے اس لیے وہ ہر لحظہ اپنی تحفظ کے لیے مصروفِ عمل رہتا ہے۔ آج کے سماج میں انسان پہلے سے زیادہ خطرات میں گھرا ہوا ہے۔ اور وہ شعوری یا غیر ارادی طور پر ان خطرات کا مقابلہ کرتا رہتا ہے۔ ریاستیں ، ممالک، حکومتیں بنانا، قوانین کی تشکیل سازی اور نظم وضبط ترتیب دینا اور یہاں تک کہ گھر کی چار دیواری تک تعمیر کرنا سب کے سب اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے مزاحمتی افعال ہیں۔

اگر باریک بینی سے غور کیا جائے تو سماج میں انسان کا مقابلہ ماحول اور فطرت سے بھی ہے اور اپنے جیسے انسان سے بھی۔ انسان فطری طور پر ہوس پرست زیادہ واقع ہوا ہے۔ وہ کبھی اپنی حالت پر مطمئن نہیں رہتا۔ وہ آگے سے آگے بڑھتے رہنا چاہتا ہے۔ ایک مقصد طے کرتا ہے تو دوسرے مقصد کی طرف چلا جاتا ہے۔ اس سفر زیست کے دوران انھیں دوران سفر جس قسم کی رکاوٹیں پیش آتی ہیں وہ انھیں ہٹاتا چلا جاتا ہے۔ اس تناظر میں وہ اپنے جیسے کسی دوسرے انسان کو نقصان بھی پہنچانے سے گریز نہیں کرتا۔

اگر انسان کے پاس طاقت اور اختیار آجائے تو وہ مزید طاقت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور مزید طاقت کے حصول کے لیے پہلے سے حاصل شدہ طاقت کو استعمال بھی کرتا ہے۔ یوں طاقت کے استعمال سے سماج میں ایک طبقہ جو تعداد میں کم ہوتا ہے ظالم یا استحصالی ٹھہرتا ہے، جبکہ اکثریت مظلوم بن جاتی ہے اور یہی اکثریت اپنی بقا کی جدوجہد میں مصروف رہتی ہے۔

ماضی میں انسان کی سماجی زندگی زیادہ مشکل نہیں تھی۔ عام طور پر یہی ہوتا تھا کہ طاقت ور قبیلہ اچھی چراگاہوں، پانی یا مویشیوں کے لیے اپنے سے کم زور قبیلے پر حملہ کر دیتا۔ اس طرح کی مزاحمت میں دو صورتیں تھیں ۔یا تو تلوار کے ذریعے مقابلہ کرتا یا پھر فرار کی راہ اختیار کرتا۔

وقت گزرنے کے ساتھ انسان انسانی کی سماجی اور معاشرتی زندگی مشکل ہوتی گئی تو استحصال کے نت نئے طریقے اور حربے آتے گئے۔ نتیجے میں مزاحمت کے بھی نئے طور طریقے ایجاد کیے گئے۔ آج کے جمہوری دور میں سیاسی جبر کے خلاف مزاحمت کے لیے سیاسی پارٹیاں بنائی جاتی ہیں اور حزب اختلاف عام طور مزاحمتی فریضہ سر انجام دیتے ہیں۔ معاشی میدان میں مزاحمت کے لیے ٹریڈ یونینز یا پریشر گروپ بنائے جاتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے ذریعے بھی مزاحمت کی جاتی ہے۔

بلتستان کے اردو شعراء نے بھی سماج میں ہونے والی ظلم زیادتیوں، سماجی نا انصافیوں کے خلاف قلم کے ذریعے مزاحمت کی ہے۔ ذیل میں بلتستان کے منتخب اردو شعراء کے ہاں سماجی مزاحمتی رویوں کے ذیل میں۔ مذہبی تعصبات، سماجی استحصال، مذہبی منافقت، ثقافتی جبر، ناانصافی، عدالتی رویوں اور انسانی رویوں کے خلاف کی جانی والی مزاحمت کا جائزہ لیں گے۔

تاریخ ساز شخصیتیں صدیوں بعد پیدا ہوتی ہیں۔ جو قوم کی نئی راہوں کا تعین کرتی ہیں۔ انہی تاریخ ساز شخصیتوں میں سے ایک راجہ محمد علی شاہ صباؔ ہے۔ راجہ صباؔ وہ خوش نصیب شاعر ہیں جنہوں نے ہر صنف سخن میں کامیاب شاعری کی۔ راجہ صباؔ شعوری طور پر ہمیشہ جدید شاعری کی طرف متوجہ رہے۔ جدید شاعری میں شعر و ادب کے سماجی اور سیاسی مقاصد زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ بہ نسبت ان ادبی تجربات کے جن کا تعلق زبان و بیان اور بہشت وغیرہ سے ہوتا ہے۔ جدید شاعری چونکہ شعر و ادب کو عوام تک پہنچانے کا سہل ترین ذریعہ ہے اس لیے اسے مشکل اور مبہم بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ترقی پسند شاعر ذاتی معاملات کی بجائے خارجی مسائل کا شاعر ہوتا ہے۔ لیکن خارجی مسائل کی شاعری بھی اعلیٰ درجے کی شاعری اس وقت بنتی ہے جب اس میں شاعر کے ذاتی احساسات کی آنچ شامل ہو جائے۔ جب تک شاعر باہر کے مسائل کو دل سے محسوس نہیں کرتا اس میں سچی شعریت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔

راجہ صباؔء صاحب کی شاعری میں جو خارجی مسائل اور موضوعات ملتے ہیں۔ ان میں بھی انھوں نے داخلیت کا رنگ پیدا کر دیا ہے۔ راجہ صباؔ کی شاعری رومانوی اور سماجی موضوعات پر مبنی شاعری ہے۔ راجہ صاحب کی سماجی شاعری کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ملک کے سیاسی و سماجی حالات سے بہت متاثر ہیں۔ اور ان حالات و مسائل پر انھوں نے اچھے شعر کہے ہیں۔ ان کا سماجی شعور خوبصورتی کے ساتھ ان کی شاعری میں جلوہ گر ہیں۔

ذیل میں ان کی طویل نظم بعنوان "سماج کے ٹھیکہ داروں سے" سے کچھ انتخاب پیش کیا جاتا ہے جس میں مزاحمت کی واضح جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

تم نے غدارِ وطن آگ لگادی کیسی

تم نے کس چال سے ڈالا ہے اخوت میں نفاق

لوٹ لی دولتِ ایمان و سکوں لمحوں میں

پھر اڑاتے ہو مرے ملک کی غربت کا مذاق

تری سازش نے بجھائے ہیں اخوت کے چراغ

تم نے ہی پھونک کے قندیل کو خاموش کیا

خون سے تم نے سجایا ہے شبستانوں کو

عقلِ بیدار کو نغمات سے مدہوش کیا(۲۱)

بلتستان کے اردو شعراء میں پروفیسر کمال آلہامی کو موضوعاتی شاعری کے حوالے سے بہت شہرت حاصل تھی۔ موضوعاتی شاعری میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ان کی شاعری زیادہ تر خارجی مسائل پر مبنی شاعری ہے۔ کمال آلہامی حساس طبیعت کے مالک تھے۔ اس لیے وہ سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ یوں انھوں نے اپنی شاعری کے وسیلے سے اپنا احتجاج ریکارڈ کرایا۔ کمال آلہامی کا سماجی شعور پختہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے سماجی مسائل کو اپنی شاعری میں زیادہ برتا ہے۔ اگرچہ ان کی شاعری میں سیاسی اور سماجی مزاحمت دونوں ہیں۔ لیکن زیادہ شدت سے انھوں نے سماجی میدان میں مزاحمت کی۔ رباعیاتِ کمال الہامی میں شامل اکثر رباعیات مزاحمتی ہیں ۔مثلاً "آٹا چینی"،"اخلاص سے خالی نماز"،"افسر شاہی"،"امن و امان"،"امیروں کا دربار"،"تہذیبوں کا تصادم"،"ٹھیکہ دار"،"جہاد و فساد"،"چمچہ گیری"،"طلاق" اور "غلامی" وغیرہ صفِ اول میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ ذیل میں نمونے کے طور پر دہشت گردی سے متعلق ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

اس کو نہیں انسان سے جب ہمدردی

تب کرتا ہے دن رات وہ دہشت گردی

کج فہم مسلمانوں کی کج فہمی سے

ہوتی ہے مسلمانوں کے خون کی بارش(۲۲)

ادبی میدان میں ایک اور باغیانہ نظریہ ترقی پسندی تھا۔ یہ باقاعدہ تحریک تھی اور اس کا واضح نصب العین تھا۔ اگرچہ ان نے فکری غذا مارکس سے حاصل کیا۔ تاہم اس نے جدیدت سے بھی بہت کچھ حاصل کیا۔

وطن عزیز کے مخصوص حالات میں غربت، افلاس، بھوک، عدالتی ناانصافی اور جہالت کے خلاف جدوجہد کرنے کے ساتھ اس وقت یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ لوگوں کو دقیانوسی سوچ سے

بھی نجات دلائی جائے۔ اور انھیں روشن فکری کی طرف مائل کر دیا جائے۔ یہ وہ سماجی حالات تھے جن میں غلام حسن حسنیؔ نے شاعری شروع کی۔ ان کی شعری پرورش لاہور میں ہوئی تھی۔ اس لیے وہ بلتستان سمیت پاکستان کے دوسرے شہروں کے حالات سے بھی بخوبی واقف تھے۔ اس لیے بلتستان کے اردو شعراء میں انھیں نمایاں مقام حاصل ہے۔ غلام حسن حسنیؔ کے اردگرد صورتِ حال تیزی سے تبدیل ہو رہی تھی۔ پرانے سماج کی جگہ نیا سماج جنم لے رہا تھا۔ ان تبدیلیوں میں غلام حسن حسنیؔ کے لیے جو ناپسندیدہ تھیں۔ انھوں نے ان کی خوب مذمت کی۔

غلام حسن حسنیؔ نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ لیکن ان کی نظموں اور غزلوں میں سماجی مزاحمتوں کے آثار زیادہ نمایاں ہیں۔ بھوک، غربت اور افلاس کے مارے ہوئے لوگوں کی وہ یوں ترجمانی کرتے ہیں:

ہر ابتلا کے زیرِ اثر ہیں غریب لوگ

اس خاکداں میں خاک بسر ہیں غریب لوگ

کیوں قافلے دکھوں کے اسی سمت ہیں رواں

بے حال، بے قرار جدھر ہیں غریب لوگ(۲۳)

نظم "بامِ جہاں" میں امن و امان سے خالی معاشرے کی یوں تصویر کشی کرتے ہیں

مرے جنگل کے باسی، مضطرب بے چین پھرتے ہیں

غزالوں کی حسین مضموم آنکھوں سے کسے معلوم

ٹپ ٹپ ابر بردار انسانوں سے

کوئی بے زبانوں کو

یہ اس ماحول کی زینت ہیں، رونق ہیں

پرندے بھی دبک کے رو رہے ہیں آشیانوں میں

گھٹا جاتا ہے دم بارود کی بُو سے

کہاں ہیں فاختائیں

امن کی پرواز کے قابل(۲۴)

احسان علی دانش کا شمار بلتستان

کے رومان پسند شعراء میں ہوتا ہے۔"شکستہ ناؤ" سے شروع ہونے والا شعری سفر "ساحل مراد"تک آتے آتے انھیں کم و بیش اٹھارہ سال لگے۔لیکن رومان پسندی سے انہوں نے جان نہیں چھڑایا۔

احسان دانشؔ کی شاعری میں رومان ہونے کے باوجود وہ سماجی مسائل سے لا تعلق نہیں رہے۔بلکہ ایک حساس ،دردمند اور انسان دوست شاعر کی حیثیت سے سماجی اتار چڑھاو کو بھی قلم سے نشان زد کرتے نظر آتے ہیں۔ان کا دکھ انسانیت کا دکھ ہے۔وہ چار سو نفرتوں کا خاتمہ کر کے محبتوں کا پرچار کرنا چاہتے ہیں۔ذیل میں ان کی کتاب "شکستہ ناؤ"میں شامل ایک غزل سے انتخاب ملاحظہ ہو جس میں سماجی مزاحمت کی واضح جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

کون کہتا ہے کہ طوفان سے ڈر لگتا ہے

مجھ کو اس شہر کے انسان سے ڈر لگتا ہے

اپنے سینے سے لگا کر سرِ منبر واعظ

ہم سے کہتا ہے کہ شیطان سے ڈر لگتا ہے

نام مسلم ہے مگر خون کے پیاسے ہیں سبھی

ایسے خونخوار مسلمان سے ڈر لگتا ہے(۲۵)

گلگت بلتستان میں احسان علی دانشؔ اپنی رنگین شاعری کی وجہ سے ہر خاص وعام میں مقبول ہے۔ اگرچہ ان کی دوسری شعری کتاب "شکستہ ناؤ" میں رومانوی شاعری کا غلبہ زیادہ ہے۔ لیکن مکمل کتاب پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے سماجی مسائل اور اونچ نیچ سے چشم پوشی بھی نہیں کی۔ فلسطین اور کشمیر کے مظلوموں کی پکار، رشوت ستانی، رہنماؤں کے روپ میں رہزنی، ملائیت، دہشت گردی، عدالتی نظام، زبان بندی جیسے موضوعات پر انہوں نے قلم فرسائی کی۔ ذیل میں گلگت کے کشیدہ حالات کے تناظر میں لکھی گئی ان کی غزل سے ایک انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔ جس کو تحریر کر کے دانشؔ نے مزاحمت کار ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔

نہاں سینے میں کیسا غم، اُدھر بھی ہے اِدھر بھی ہے

یہ پُر اسرار چشمِ نم اُدھر بھی ہے اِدھر بھی ہے

قسم فتنوں کی جن کے کفر سے طرفین زخمی ہیں

بلند اسلام کا پرچم اُدھر بھی ہے اِدھر بھی ہے

کہیں اٹھتے جنازے ہیں کہیں گرتی ہوئی لاشیں

بڑا بے کیف سا عالم اُدھر بھی ہے اِدھر بھی ہے

سکوں، حفظ و اماں، خوشیاں، نشاطِ غم کا سب ساماں

یہ سب کچھ درہم و برہم اُدھر بھی ہے اِدھر بھی ہے

یہ کارستانیاں ڈالر کی ہو سکتی ہیں باہر کے

مجھے لگتا ہے کچھ انکم اُدھر بھی ہے اِدھر بھی ہے(۲۶)

نوجوان شاعر افضل روشؔ نے جہاں سیاسی میدان میں سخن گوئی کے ذریعے بھرپور مزاحمتی لہجہ اختیار کیا۔وہیں سماجی میدان میں بھی بھرپور مزاحمتی رویے کا مظاہرہ کیا۔وہ اکبر الٰہ آبادی کی طرح اقوامِ مغرب کی بے جا اور اندھا دھند تقلید ،بے سمتی سے حصول تعلیم،معدوم ہوتی تہذیب و تمدن اور مغربی تہذیب و ثقافت کی یورش کو نشانہ تضحیک بناتے ہیں۔

افضل روشؔ دوسرے قوموں کی دیکھا دیکھی اپنے تہذیب و ثقافت سے دور ہوتے نوجوانوں سے نالاں ہے۔ان کے خیال میں مرد کو ایک مرد نظر آنا چاہیے۔وہ مرد اور عورت میں ایک خاص قسم کا فرق دیکھنا چاہتے ہیں۔ظاہر ہے وہ معاشرہ جہاں مرد بھی عورتوں کی طرح فیشن کا لبادہ اوڑھیں تو وہ معاشرہ دنیا کی قیادت کی ذمہ داری اٹھانے کے قابل نہیں رہتے۔

افضل روشؔ ان تمام تر تبدیلیوں کو یزیدیت کی ثقافت سمجھتے ہیں:

یزیدیت کی ثقافت کا بول بالا ہے

یزیدیت کے اردوں کو رائیگاں دیکھوں

غمِ حسین سے دل میں یہ آرزو اٹھی

کہ اپنے سر کے لیے بھی کوئی سناں دیکھوں(۶۷)

جو قوم اتفاق و اتحاد کی بجائے انتشار کا شکار ہو اس

قوم کے لیے کسی منزل تک پہنچنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اس لیے افضل روشؔ عالم کے روپ میں چھپے ملایت کو بھی ہدف تنقید بناتے ہیں ۔جو اسلام کا نام لے کر فرقہ پرستی اور تفرقہ پرستی کو ہوا دیتے ہیں۔ در اصل روشؔ امن کا پیغامبر ہے۔ امن کے بغیر اور بھائی چارہ گی کے بغیر کوئی بھی ملت، قوم اور معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔ لہذا وہ عالم اسلام کو مخاطب کر کے ان کے کردار پر یوں سوالیہ نشان اٹھاتے ہیں:

ممکن نہیں تب تک تجھے حاصل ہو بلندی

جب تک رہے موجود یہاں فرقہ پرستی

قبضے میں ہے اغیار کے کیوں ارضِ فلسطین

ہے قبلہ اول کی یہی عزت و توقیر

آجاؤ روشؔ مل کے پڑھیں نعرہ تکبیر

آزاد کریں کفر سے ہم وادی کشمیر(۲۸)

افضل روشؔ کا دکھ سماجی مزاحمت کی ذیل

میں اپنے علاقے سے مسلم روایات کی پامالی کا دکھ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہمارا تہذیب و تمدن تو فرنگیوں نے لوٹ لیا تھا۔ اور جو کچھ بھی بچا تھا اس پر باقی اقوام عالم کی تہذیب و ثقافت کے اثرات بہت زیادہ ہیں۔ اس لیے ایک سچے اور کھڑے شاعر کے لیے ان تمام تر حالات میں خاموش رہنا اور سماجی جبر کے خلاف چپ رہنا شرم کا باعث ہے۔ ان کے بقول:

میں ہجر کی زندان میں محصور رہوں کیا

تو خود ہی بتا تجھ سے کہ میں دور رہوں کیا

مختار بنایا ہے مجھے میرے خدا نے

میں جبر کے اس شہر میں مجبور رہوں کیا(۲۹)

بلتستان کے نوجوان شعراء میں ،صفِ اول میں شمار کیے جانے والے نابغہ روز گار شاعر ذیشانؔ مہدی نے اپنی شاعری میں اپنے دور کی سماجی صورتِ حال کو بہتر انداز میں موضوع بنایا ہے۔ اور ہر اس بات پر تنقید کی ہے جو انھیں ناپسندیدہ تھی۔ اگر چہ ان کا رویہ مکمل مزاحمتی نہیں لیکن اس کے باوجود سماجی مسائل سے انہوں نے چشم پوشی نہیں کی۔ جہاں جہاں ضرورت محسوس کی انھوں نے مزاحمتی لہجہ ضرور روا رکھا۔

ذیشانؔ اپنے دور کے بدلتے ہوئے حالات کی خود گواہ ہے۔ اس لیے انہوں نے غزلوں میں اپنے دور کی صورتِ حال کو بھی قلم بند کرنے کی کوشش کی۔ عدالتی رویے ہو یا سن اٹھاسی کا دلخراش واقعہ ،نادرا کی طرف سے گلگت بلتستان کے باسیوں کو مہاجرین ظاہر کرنے کی کوشش پر احتجاج ہو یا معرکہ کرگل کا دکھ ، ملایت ، فرقہ پرستی ، سماج میں غیر منصفانہ نظام غرض ذیشانؔ نے اپنی سمجھ ، فہم اور بساط کے مطابق ہر سماجی خامیوں پر اپنی شاعری کے ذریعے احتجاج کی ہے۔ ذیل میں ایک غزل نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ جس میں ان کا مزاحمتی لہجہ ابھر کر سامنے آتا ہے:

لے کر امامِ وقت کو بھی اعتماد میں

شامل ہوا ہوں لشکرِ ابنِ زیاد میں

بندوں کا اب کے کوئی بھی نقصاں نہیں ہوا

بس اک خدا کا گھر ہی جلا ہے فساد میں

کچھ لوگ کائنات کو تسخیر کر گئے

مصروف رکھ کے ہم کو مسلسل جہاد میں

خوشیاں منا رہے ہیں مسلمان عید کی

اسلام رو رہا ہے محمد کی یاد میں(۳۰)

ہمارے سماج کا ایک اور اہم مسلہ دولت کی غیر مساویانہ تقسیم ہے۔ جس کی وجہ سے امیر روز بروز امیر تر اور غریب، غریب سے غریب تر ہو تا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرے میں بھوک، غربت، افلاس، باداری اور بے روز گاری میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ لوگوں میں مال و دولت کی ہوس، طمع اور لالچ اس قدر پیدا ہوا ہے کہ اس کے لیے رشوت اور بوگس امپورٹڈ پر مٹ کا سہارا لینے سے بھی نہیں کتراتے۔ دولت کی ہوس میں غریبوں کا مال بھی ہڑپ کر جاتے ہیں۔ یہی لوگ لوٹ مار کا بازار گرم رکھتے ہیں۔ یوں معاشرہ تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ ہونے کے باوجود روز بروز اخلاقی تنزلی کا شکار ہو تا جا رہا ہے۔ ایسے گہما گہمی کے عالم میں غریبوں کی پکار پر کون کان دھرے؟؟ ذیشان نے اسی سماجی منافقت کی طرف اپنی نظم "حادثہ" میں یوں اشارہ کیا ہے:

امیر شہر اپنے محل میں

بے حد مزے سے سو رہا ہے

مگر باہر ہوا بھی تیز ہے

بارش بھی جاری ہے

بہت سردی بھی ہے

اور رات بھی تاریک ہے بے حد

بس ایسے میں

غریب شہر کے کچے مکاں کی چھت گری ہے(۳۱)

ہر حقیقت گو شاعر اپنے زمانے کا ایک بہترین نقاد بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے حالات کو دیکھ کر ان پر ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے۔ عاشق حسین عاشقؔ نے اگرچہ غزل کی روایتی اٹھان سے انحراف تو نہیں کیا۔ لیکن اس کے باوجود "گمشدہ خواب" میں شامل غزلیں اس دور کے سماجی حالات کو سمجھنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔ سماجی مزاحمت کے باب میں ان کا چند نمونہ کلام یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ جس سے عاشق حسین عاشقؔ کے ہاں سماجی سطح پر پائے جانے والے مزاحمتی رویوں کو سمجھنے میں آسانی ہو گی۔

امیرِ شہر کو کانٹا چبھے تو شور اٹھتا ہے

مگر سنتا نہیں کوئی بکا مجبور لوگوں کی(۳۲)

چھن گیا علم و یقین بے خبری عام ہوئی

جب سے اس شہر میں طرزِ لہبی عام ہوئی(۳۳)

جس کے ہاتھوں میں کتابیں نہیں بندوقیں ہیں

اس کی تقدیر میں لکھا ہے فنا کا رستہ

شیخ صاحب نے معمہ سا بنا رکھا ہے

ورنہ مشکل نہیں، آساں ہے خدا کا رستہ(۳۴)

سر بلند ہوتے ہیں ان کے نوکِ نیزہ پر

لوگ جو زمانے کو باشعور کرتے ہیں

اپنا فائدہ ہو تو دین بیچ دیتے ہیں

پھر بھی ہم مسلمانی پر غرور کرتے ہیں(۳۵)

انسانی فطرت ہے کہ انسان برائی میں کشش زیادہ محسوس کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان نے دھیرے دھیرے ان تمام زنجیروں کو دوبارہ سے پہننا شروع کیا۔ انہی میں سے ایک زنجیر غیر اسلامی رسوم کی پابندی ہے۔ ان رسومات میں سے ایک ایک فرسودہ رسم جہیز دینے کی پابندی ہے۔ ہمارے معاشرے میں اس فرسودہ رسم کی رواج پڑنے سے بہت سے معاشرتی خامیوں نے جنم لیا ہے۔ اس سماج میں رہنے کے لیے غریب والدین کو اپنے بچیوں کی شادی کرنے کے لیے بھاری قرض لینا پڑتا ہے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں بنتِ مفلس والدین کے گھر میں پڑی رہ کر سر میں چاندی اتر آتی ہے۔

عباس سفیرؔ اگرچہ سخن گوئی کے میدان میں نو وارد ہیں۔ لیکن سماجی برائیوں سے انہوں نے آنکھیں نہیں چرائی۔ جس کامیابی

اور بے باکی سے وہ سیاسی میدان میں مزاحمت کا علم بلند کرتے ہیں اسی توانائی کے ساتھ سماجی میدان میں بھی مزاحمت کرتے نظر آتے ہیں۔ان کی پہلی کتاب "سراب" میں شامل ان کی نظم "دعاؤں کا جہیز" ہمارے سماجی خامیوں کا پوسٹ مارٹم ہے:

بنگلہ کوئی، نئی کار بھی

زیور کا پہاڑ۔۔۔۔

دخترِ خاص تو کیا کیا نہ لئے جائے جہیز

یہ مگر دوسری جانب!!

ماں کے رلتے ہوئے ارمان

تو خَم باپ کا سر

سوکھی آنکھوں میں لئے پر کوئی حسرت کا چراغ

بنتِ مفلس نے لیا

صرف دعاؤں کا جہیز۔۔۔(۳۶)

عباس سفیرؔ کا نظریہ زندگی فن سخن گوئی میں مقصدی شاعری ہے۔اس لیے وہ سماجی رویوں کے خلاف مزاحمت کرنے کے ساتھ ایک مصلح کا کردار بھی ادا کرتے ہیں۔ان کی دوسری کتاب "بانگِ صبحِ انقلاب" میں شامل زیادہ تر شاعری سیاسی و سماجی رویوں کے خلاف مزاحمت پر مبنی شاعری ہے۔

میرؔ افتخار کا شمار بھی عباس سفیرؔ کے قبیل میں ہوتا ہے۔میرؔ افتخار اگرچہ بلتستان کے نوجوان شعراء میں سے ہے۔تاہم ان کا فنی اور فکری پختگی کسی سے کم نہیں۔ان کا لب ولہجہ اور انداز تخاطب

شاعری میں مکمل مزاحمتی ہے۔ میرآفتخار نے جہاں سیاسی میدان میں مزاحمت کا پرچار کیا وہیں سماجی ناانصافیوں کے خلاف بھی بطور مزاحمت کار اپنا کردار خوب نبھاتے ہیں۔ ان کے ہاں سماجی ناانصافی، بھوک، غربت، افلاس، رشوت، عدالتی ناانصافی جیسے موضوعات پر مزاحمتی رویہ زیادہ نمایاں ہے۔ ان کا دکھ انسانیت کا دکھ ہے۔ وہ معاشرے میں غریب اور امیر میں فرق نہیں دیکھنا چاہتا۔ سماج میں امن اور انصاف کا بول بالا ان کا مطمع نظر ہے۔

میں فقیرِ رہ یقین لوگو

میں سوال سراب کیا بُنتا؟

عمر روٹی کی جستجو میں کٹی

بادشاہی کے خواب کیا بُنتا؟

رختِ شب تھا نہ راستے ہمدم

چاندنی کی رکاب کیا بُنتا؟(۳۷)

الغرض بلتستان کے منتخب اردو شعراء کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بلتستان کے اردو شعراء نے نہ صرف سماجی برائیوں اور خامیوں کے خلاف مزاحمت کیا ہے بلکہ ان خامیوں کو نشان زد کرتے ہوئے عوام الناس میں شعور اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ حسرتؔ، محمد حسن، تاریخِ ادبیاتِ بلتستان، ناشر ندارد، ۱۹۹۲، ص ۲۰۹

۲۔ حسرتؔ، محمد حسن، تاریخِ ادبیاتِ بلتستان، ناشر ندارد، ۱۹۹۲، ص ۲۱۰

۳۔ دانشؔ، احسان علی، شمال کے ستارے، رومیل ہاوس آف پبلی کیشنز راولپنڈی، ۲۰۱۴، ص ۱۲۵

۴۔ سید، اسدؔ زیدی، رنگِ شفق، ایس ٹی پرنٹر راولپنڈی، ۱۹۸۶، ص ۹

۵۔ ایضاً، ص ۴۵/۴۴

۶۔ الہامی، حشمت علی کمالؔ، بحوالہ موج ادب (سہ ماہی) گلگت بلتستان، کمال الہامی نمبر، شمارہ ۲ تا ۱۴، اپریل ۲۰۱۵ تا اپریل، ص ۱۴۶

۷۔ حسنیؔ، غلام حسن، بادلوں کا سفر، غیر مطبوعہ، ص ۴۳

۸۔ حسنیؔ، غلام حسن، غزلیاتِ حسنی، غیر مطبوعہ، ص ۵۵

۹۔ ذیشانؔ مہدی، درد کی پہلی دھوپ، ناشر ندارد، ۱۹۹۹، ص ۴۸

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۷

۱۱۔ ذیشانؔ مہدی، نئے خواب کی خواہش، بزمِ علم و فن سکردو، ۲۰۰۶، ص ۱۰۵

۱۲۔ facebook.com/zeemehdi777، تاریخ: ۲۲ فروری ۲۰۲۱، وقت ۱۰ بجے دن

۱۳۔ روشؔ، محمد افضل، درد پا، ناشر ندارد، ۲۰۰۴، ص ۴۸

۱۴۔ ایضاً، ص ۵۱

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۰۱

۱۶۔ عاشقؔ، عاشق حسین، گمشدہ خواب، میونسپل لائبریری سکردو، ۲۰۱۴، ص ۸۲

۱۷۔ ایضاً، ص ۵۲

۱۸۔ عباس سفیرؔ، سراب، معراج الدین پرنٹر لاہور، س۔ن، ص ۹۹

۱۹۔ عباس سفیرؔ، بانگِ صبحِ انقلاب، مہناج العلم پبلی کیشنز، ۲۰۱۵، ص ۶۱/۶۰

۲۰۔ میر افتخار، قلم سوزی ارمان، ماورا پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۱، ص ۱۲۷/۱۲۶

۲۱۔صباؔ، راجہ محمد علی شاہ، بحوالہ انتخاب صبا نمبر گلگت بلتستان (سہہ ماہی)، اگست تا اکتوبر ۲۰۰۳، ص ۲۴

۲۲۔الہامی، پروفیسر حشمت علی کمالؔ، رباعیاتِ کمالؔ، ملک پرویز پرنٹر لاہور، ۲۰۱۰، ص ۱۸۸

۲۳۔ حسنیؔ، غلام حسن، بادلوں کا سفر، غیر مطبوعہ، ص ۵۵

۲۴۔ ایضاً، ص ۶۲

۲۵۔ دانشؔ، احسان علی، شکستہ ناؤ، ناشر ندارد، ۲۰۰۱، ص ۱۱۷

۲۶۔ دانشؔ، ساحلِ مراد، بزمِ علم و فن سکردو، ۲۰۱۸، ص ۸۵ / ۸۴

۲۷۔ روشؔ، محمد افضل، درد پا، ناشر ندارد، ۲۰۰۴، ص ۴۰

۲۸۔ ایضاً، ۱۰۸

۲۹۔ ایضاً، ۱۱۴

۳۰۔ ذیشانؔ مہدی، نئے خواب کی خواہش، بزمِ علم و فن سکردو، ۲۰۰۶، ص ۱۷

۳۱۔ ذیشانؔ مہدی، درد کی پہلی دھوپ، ۱۹۹۹، ص ۹۰

۳۲۔ عاشقؔ، عاشق حسین، گمشدہ خواب، میونسپل لائبریری سکردو، ۲۰۱۴، ص ۴۳

۳۳۔ ایضاً، ص ۸۰

۳۴۔ ایضاً، ص ۶۰

۳۵۔ ایضاً، ص ۲۳ / ۲۲

۳۶۔عباس سفیرؔ، سراب، معراج الدین پرنٹر لاہور، س۔ن، ص ۱۶۱

۳۷۔ میر افتخار، قلم سوزی ارمان، ماورا پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۱، ص ۵۹

باب چہارم

گلگت اور بلتستان کے منتخب شعراء کے ہاں مزاحمتی زاویوں کا تقابلی مطالعہ

الف۔ گلگت اور بلتستان کی اردو شاعری میں سیاسی مزاحمتی زاویوں کا تقابلی جائزہ

کوئی بھی حق گو ادیب سماج سے الگ رہ کر آفاقی ادب تخلیق کر ہی نہیں سکتا۔ ایک کامیاب ادیب تنہا رہنے کی بجائے عوام کے درمیان رہ کر ان کی دکھ درد کو سمجھ کر ان کی بنیادی مسائل کو اپنی تخلیق کا حصہ بناتا ہے۔ کیونکہ ان کا مطمع زندگی

انسان اور سماج سے محبت ہے۔ اگر ادب انسانیت سے ہم آہنگ نہ ہو یا ادب میں انسانیت سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت نہ ہو تو وہ ادب ناکام و نامراد رہے گا۔

ادبی تخلیق کا مقصد صرف روزی رزق کمانا نہیں بلکہ ادبی تخلیق کا مقصد اور مقام اس قدر پاکیزہ اور بلند تر ہے کہ وہ تقدیس کی سر حدوں کو چھو لیتا ہے۔ چونکہ شاعر اور دیوتا میں تخلیق کر سکنے کی بھرپور صلاحیت ہوتا ہے۔ اسی لیے قدیم یونانیوں نے شاعروں کو بھی دیوتاؤں کی صف میں شامل کیا تھا۔

انسان کو قدرت کی

طرف سے عطا کردہ نعمتوں میں سب سے اہم چیز اس کی شعوری قوت تخلیق ہے۔ یہی وہ قوت تخلیق ہے جس کے بل بوتے پر انسان کو حیوان سے ممتاز کر کے اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز کر دیتا ہے۔ انسان کی بے شمار خوبیوں میں سے ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ جانوروں کی طرح اپنے ماحول میں اسیر رہنے کی بجائے فطری جمود کو توڑ کر اپنے گرد و پیش کے ماحول کو یکسر تبدیل کر دیتا ہے۔ انسان میں نہ صرف ماحول کو تبدیل کرنے کی صلاحیت ہے بلکہ وہ ماحول کو اپنی مزاج کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ اس طرح ماحول میں تبدیلی خود انسان کی تبدیلی کا باعث بنتا ہے۔ اور یہ تبدیل شدہ انسان نئی توانائی کے ساتھ گرد و پیش کے ماحول پر اثر انداز ہوتا ہے۔ عمل اور ردِ عمل کا یہ نہ ختم ہونے والا سلسلہ روز ازل سے لے کر اب تک جاری و ساری ہے۔

جب ہم ادب کی بات کرتے ہیں تو ادب اور آرٹ کا بنیادی مقصد بھی یہی ہے۔ کہ انسان نے ہمیشہ ادب اور آرٹ کا استعمال حقیقت کو تبدیل کرنے کے لیے کیا۔ اس ضمن میں اگر بات کی جائے تو ادب حقیقت کو تبدیل تو کرتا ہے لیکن ماحول پر براہ راست اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ادب پتھر سے بُت نہیں تراشتا، مٹی سے پیالے نہیں بنا سکتا اور کلہاڑی کی طرح درخت کاٹنے کی صلاحیت ادب میں نہیں۔ مگر ادب احساسات اور جذبات سے نئی نئی تصویریں ضرور بناتا ہے۔

ادب پہلے انسان کے جذبات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ پھر جذبات میں تغیر و تبدل انسان کے اندر داخلی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔یہی داخلی تبدیلی انسان کے ذریعے ماحول اور سماج میں تبدیلی اور انقلاب کا باعث بنتا ہے۔اس لیے ادب اور شاعری کا براہ راست تعلق انسان کے جذبات کو منظم سانچے میں ڈھال کر پیش کرنا ہے۔شاعری کی انہی خصوصیات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے درج ذیل سطور میں گلگت اور بلتستان کی اردو شاعری میں سیاسی سطح پر پائے جانے والے مزاحمتی رویوں کا تقابلی جائزہ لیں گے۔

دستیاب تاریخی حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ گلگت بلتستان پر ماضی میں آزاد اور خود مختار حکمران مختلف ادوار میں حکومتیں کرتی رہی ہیں۔ لیکن امتدِ زمانہ کے ساتھ انیسویں صدی کے عوائل میں فوجی جارحیت کے ذریعے ان علاقوں پر ڈوگروں اور انگریزوں کا تسلط قائم رہا، مگر اس ناجائز تسلط اور قبضے کو یہاں کے عوام نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔اور ان ناجائز تسلط کے خلاف یہاں کے نہتے عوام کو جب جب بھی موقعہ ملا، مسلح جدوجہد اور مزاحمت ہوتی رہی۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ قیام پاکستان کے ساتھ ۴۸-۱۹۴۷ء میں یہاں کے عوام نے اپنی مدد آپ کے تحت بیرونی استبداد کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ لڑی گئی جس کے نتیجے میں اس خطے کو بیرونی استبداد سے آزاد کر کے تین مختلف مراحل میں پاکستان کے ساتھ الحاق کیا گیا۔ لیکن اس مخلصانہ جدوجہد اور کوششوں کے باوجود گلگت بلتستان کی آئینی حیثیت کا تعین ابھی تک نہیں ہو سکا۔اور یہاں کے باسی آج بھی اپنی شناخت کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

بظاہر تو گلگت بلتستان کو قومی آئینی دھارے میں شامل نہ کرنے کی وجہ اقوام متحدہ کی متنازعہ ریاستِ جموں کشمیر کے متعلق قراردادیں بتائی جاتی ہیں۔ لیکن نامور محقق خواجہ محمد قاسم نسیم اپنی کتاب "مسئلہ کشمیر اور گلگت بلتستان" میں اقوام متحدہ کی انہی قراردادوں کے حوالے سے گلگت بلتستان کی پوزیشن کے تمام تر علل و اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے گلگت بلتستان کے آئینی حیثیت کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

"گلگت بلتستان مقبوضہ ریاستِ جموں کشمیر کا حصہ ہونے کی بنیاد پر نہیں بلکہ صرف اور صرف قومی مفاد کے پیشِ نظر مقبوصہ کشمیر میں ہونے والے استصواب رائے تک گلگت بلتستان کو موجودہ مخصوص پوزیشن میں رکھا گیا ہے۔ حکومت پاکستان اس حقیقت سے بجا طور پر بخوبی واقف تھی یہی وجہ ہے کہ گلگت بلتستان کے پاکستان میں شمولیت کے بعد اس خطے کو حکومتِ پاکستان کے ہی زیرِ انتظام رکھا اور متنازعہ ریاست جموں وکشمیر کے پاکستان کے زیرِ حصے آزاد کشمیر کی طرح یہاں عبوری آئین کے تحت علیحدہ سے عبوری حکومت قائم نہیں کی"(۱)

گلگت بلتستان کا اہم ترین مسئلہ شناخت کا مسئلہ ہے۔ یہاں کے عوام آزادی سے لے کر اب تک کئی عشرے گزرنے کے باوجود قومی اور آئینی شناخت سے محروم ہیں۔ گلگت بلتستان کا اب تک آئینی حیثیت واضح نہ ہونے کی وجہ سے اب تک ان علاقوں کے نظام کے اوپر کوئی واضح اور مضبوط آئینی چھتری نہیں۔ گلگت بلتستان میں اگرچہ قانون ساز اسمبلی موجود ہے۔ لیکن ان کے پاس بھی محدود اختیارات ہیں۔ بلکہ یوں کہیے قانون ساز اسمبلی بنانے سے پہلے گلگت بلتستان کا سارا نظام لیگل فریم ورک اور رولز آف بزنس کے تحت چلایا تھا۔ اور وزارت امور کشمیر جو نوٹو فیکشن جاری کرتے وہی اس خطے کے لیے قانون اور آئین کا درجہ رکھتے، آج بھی وہی طریق جاری ہے۔

گلگت بلتستان میں آئینی تحفظ

نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کے بنیادی حقوق ہی محفوظ نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو ان کی بنیادی حقوق کی ضمانتیں اعلیٰ اور آئینی عدالتیں فراہم کرتی ہیں۔ لیکن گلگت بلتستان میں عدالتیں ہونے کے باجود وہ عدالتیں آئینی نہیں جو حکومتی اقدامات کے خلاف رٹ پٹیشنوں کی سماعت کر سکیں اور آئینی کردار ادا کر سکیں۔

گلگت بلتستان میں قائم چیف کورٹ اگر چہ کسی بھی صوبائی طرز کی ہائی کورٹ کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن اس کے پاس وہ تمام تر اختیارات نہیں جو کسی بھی صوبائی ہائی کورٹ کو حاصل ہے۔ اسی طرح یہاں قائم اپلیٹ کورٹ کے پاس بھی وہ تمام تر اختیارات نہیں جو اسے حاصل ہونی چاہیے۔ ججوں کی ترقی و تنزلی، مدت ملازمت، معاملات سے متعلق امور نمٹانے کے لیے یا ججوں کی تقرری، تبادلے اور ملازمت سے متعلق امور چلانے کے لیے بیوروکریسی کا کردار زیادہ ہے۔ اس طرح منظم قانونی اور اعلیٰ عدالتی نظام نہ ہونے کی وجہ سے یہاں

کے فاضل ججوں کو خود اپنی سروسز کے دوران انصاف نہیں ملتا تو وہ سماج میں لوگوں کے حقوق کا کیسے تحفظ کرے گا؟نامور محقق محمد قاسم نسیم اس ضمن میں گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"گلگت بلتستان میں اگرچہ جمہوری ڈھانچہ صوبائی طرز پر موجود ہے۔لیکن آئینی تحفظ حاصل نہ ہونے کے باعث جمہوری اداروں کے اوپر بھی بیوروکریسی بہت زیادہ حاوی ہے۔مشیروں کی بہ نسبت متعلقہ محکموں کے سیکریٹریز زیادہ بااختیار ہیں۔وزارت امور کشمیر کے سیکریٹری اور دیگر حکام تو ایک لحاظ سے طوفان میں موجود شمالی علاقوں کی کشتی کے ناخدا ہیں۔جن کو صحیح سمت کا بھی ٹھیک طرح سے ادراک نہیں ہے۔یہ وہ حالات ہیں جن کی بنا پر گلگت بلتستان کے عوام کے دلوں میں احساس محرومی کا پیدا ہونا ایک یقینی امر ہے"(۲)

آئینی

حوالے سے گلگت بلتستان کے لوگوں کی احساس محرومی کو گلگت اور بلتستان کے شعراء نے نہ صرف محسوس کیا ہے بلکہ عوامی آواز بن کر اشعار کی صورت میں بھرپور احتجاج کیا ہے۔گلگت شہر چونکہ گلگت بلتستان کا دار لخلافہ ہے۔اس لیے یہ سیاسی اور سماجی طور پر اٹھنے والی تمام تحریکوں کا مرکز رہی ہے۔شائید یہی وجہ ہے بلتستان کے شعراء کی بہ نسبت گلگت کے شعراء نے آئینی احساس محرومی کو زیادہ محسوس کیا ہے۔جس کا مسلّمہ ثبوت ان کی تخلیقات ہیں۔

گلگت بلتستان کو اگرچہ پاکستان کے ساتھ شامل ہو کے بہت

عرصہ بیت چکا ہے۔لیکن ان علاقوں کے متعلق کئی سوالوں کے جواب اب تک دستیاب نہیں۔ان میں سے چند سوالات کچھ اس طرح کے ہیں: کیا گلگت بلتستان ریاست جموں کشمیر کا حصہ ہیں یا ان کی الگ آئینی حیثیت ہے؟کیا کشمیر کے ریفرنڈم تک ان علاقوں کا مستقبل غیر یقینی اور غیر واضح رہے گا؟کیا یہ ضروری نہیں گلگت بلتستان کی بین الاقوامی حیثیت کو مد نظر رکھ ان علاقوں کے متعلق وفاق پاکستان حقیقت پسندانہ انداز میں غور و فکر کیا جائے؟کیا گلگت بلتستان پاکستان کا پانچواں صوبہ ہے؟ اگرچہ گلگت بلتستان آزاد کشمیر کا حصہ نہیں لیکن گلگت بلتستان کی موجودہ حیثیت پاکستان کے باقی صوبوں کی طرح بھی نہیں۔یہ وہ سوالات ہیں جس کے جواب کسی کے پاس بھی نہیں۔یوں یہاں کے ادیب اور شاعر اپنی اپنی دانست کے مطابق ان

ناانصافیوں کے خلاف مزاحمتی علم تھام کر میدان عمل میں عوامی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں اگرچہ کم ہی سہی لیکن بلتستان کے شعرا بھی پیچھے نہیں رہے۔

گلگت بلتستان کے آئینی حثیت کو مسئلہ کشمیر کے ساتھ نتھی کر کے ان علاقوں کے مستقبل کو تاریکی میں دھکیلنے کے باوجود یہاں کے شعراء نے کشمیر کے مظلوموں کی آہ وبکا سے چشم پوشی نہیں کی۔ بلکہ ان جنت نظیر وادیوں پر ناجائز قبضے کے خلاف آواز حق بلند کرنے کے ساتھ مظلوم کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کو خراج تحسین بھی پیش کیا ہے۔ اگرچہ گلگت بلتستان کی اردو شاعری کی سیاسی مزاحمتی باب میں خطہ کشمیر پر ہندوستان کے ناجائز قبضے کے خلاف مزاحمت کم سہی لیکن کشمیریوں کے دکھ درد کو محسوس ضرور کیا ہے۔ نمونے کے طور پر گلگت بلتستان کے نامور شاعر خوشی محمد طارقؔ کی چند اشعار ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

دین کی خاطر ہے تیری کفر و باطل سے یہ جنگ

تیرے چہرے پر لہو ہے صبح آزادی کا رنگ

گر چکی ہیں خون کی بوندیں شہیدوں کی جہاں

کھل اٹھیں گے ایک دن گل ہائے آزادی وہاں

تجھ کو خود کرنا ہے کچھ اے کاشمر! اپنے لیے

کب تلک بیٹھو گے آنکھوں میں حسین چہرے لیے (۳)

میری

دانست میں ایک بالغ اور عاقل تخلیق کار کو اپنے زمانے کے حالات و واقعات اور گردو پیش سے آگاہ ہونا ایک لازمی امر

ہے۔ مگر بین الاقوامی سیاست سے آگاہ ہو کر ان مسائل کو اپنے تخلیقات کا حصہ بنادے۔ ایسا واقعہ ہمارے ادب میں شاذونادر ہی ہوتا ہے۔ گلگت بلتستان جیسا پسماندہ خطہ جس کی زیادہ تر اردو شاعری غزلیہ شاعری ہے۔ بین الاقوامی مسائل کو بیان کرنے کے چنداں متحمل نہیں ہوسکتے۔ چنانچہ اشاروں کنائیوں میں بین الاقوامی سیاسی مسائل کو شعری مالا میں پرو کر پیش کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔ گلگت بلتستان کے شعراء کا ایک طرہ امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں بین الاقوامی موضوعات کو بھی جگہ دی ہے۔ اپنے غزلیہ اشعار کے ذریعے بین الاقوامی سیاسی مسائل کو اجاگر کرنے کے ساتھ ان موضوعات پر بھرپور نظمیں بھی کہیں ہیں۔ ان میں مسئلہ کشمیر، مسئلہ فلسطین، سلامتی کونسل، ویت نام وغیرہ شامل ہیں۔ ان نظموں کو پڑھ کر گلگت بلتستان کے شعراء کے بین الاقوامی سیاست سے آگہی کا ادراک ہونے کے ساتھ ان کی تخلیقی فکر کی دائرہ وسعت بھی سامنے آتی ہے۔ البتہ بین الاقوامی سیاست کے حوالے سے گلگت کے بہ نسبت بلتستان کے نوجوان شعراء کے ہاں یہ تخلیقی شعور زیادہ دیکھنے میں آیا ہے۔ ذیل میں نوجوان شاعر احسان دانش کی کتاب "ساحلِ مراد" میں شامل ایک نظم "فلسطین کے نہتے جانبازوں کے نام" سے ایک اقتباس بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

جہاں میں اپنے کو خود اپنا منصف کہنے والو سن

غزہ والوں پہ جاری ظلم پہ حیران کب ہوں گے؟

ملے فتح و ظفر یارب فلسطین کے نہتوں کو

خدائے لم یزل پورے مرے ارمان کب ہوں گے؟

یہ گولے توپ ٹینکوں کے یہ میزائل یہ طیارے

بنام نسل شیطاں موت کے سامان کب ہوں گے؟(۴)

گلگت اور

بلتستان کی اردو شاعری کا بغور جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ گلگت اور بلتستان کے شعراء نے سیاسی مزاحمتی شاعری کی ذیل میں اپنے فن کا سفر طلوع آزادی کے بعد گلگت بلتستان اور ملک بھر میں پیدا ہونے والے صورتِ حال اور اپنے دور کے ترقی پسندانہ نظریات کے جلو میں پیش کیا ہے۔

اگر سیاسی مزاحمتی شاعری کی ذیل میں گلگت بلتستان کی

اردو شاعری میں سیاسی مزاحمتی رویوں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ گلگت بلتستان کی اردو شاعری کا ترقی پسند نظریہ ادب سے وابستگی ضرور ہے۔

آزادی سے لے کر اب

تک گلگت بلتستان کے اردو شعراء نے مصلحت پسندی اور ترمیمِ نظر کا شکار ہوئے بغیر جس دلیری اور بے باکی سے سچ کا اقرار کرتے ہوئے جو تخلیقی معیار قائم کیا ہے وہ قبولِ عام اور لطفِ سُخن دونوں حوالوں سے قابلِ داد اور لائق تحسین کام ہے۔

گلگت بلتستان کے اردو شعراء

نے اپنے ارد گرد کی ناہمواریوں، سفاکیوں، سیاسی ناانصافیوں، سماجی استحصال، ناگفتہ بہ حالات اور جبر و استبداد کے متعلق تلخ حقیقتوں کو نہ صرف شعری صورت میں بیان کیے ہیں۔ بلکہ ہمارے عہد کی غنائی شاعری کی روایت کو بھی برقرار رکھتے ہوئے اس کو دلگیر اور پُر اثر بھی بنایا ہے۔ یوں گلگت اور بلتستان کی اردو شاعری میں انقلاب، سیاسی شعور، غنائیت کا تجربہ کثرت سے موجود ہیں۔

ایک سچے شاعر اور فنکار کا فریضہ یہ ہے کہ وہ حقیقت

شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خوابِ غفلت میں ڈوبے ہوئے شہر کے مکینوں کو گرد و پیش کے حالات اور آشوب کا احساس دلائے۔ اگر گلگت اور بلتستان کی اردو شاعری کا اس حوالے سے جائزہ لیں تو یہ حقیقت واضح ہوتا ہے کہ گلگت بلتستان کے اردو

شعراء نے یہ فریضہ ایک ایسے ماحول میں سر ہتھیلی پہ رکھ کر ادا کی ہے جہاں "جنبشِ لب تو درکنار جنبشِ مژگاں بھی معتوب کرے ہے"۔اس لیے سیاسی مزاحمتی شاعری کی ذیل میں گلگت بلتستان کی اردو شاعری کی اہمیت اور شعراء کے تخلیقی کارنامے دوچند ہو جاتی ہے۔ذیل میں گلگت سے نامور شاعر حبیب الرحمٰن مشتاقؔ اور بلتستان سے نوجوان شاعر عاشق حسین عاشقؔ کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں:

لہو کی آبرو، بے آبرو ہے

زمین نے سرخیاں پہنی ہوئی ہیں

ہمارے آشیاں کی خیر مالک

فلک نے بجلیاں پہنی ہوئی ہیں

ستم کی انتہا ہے فصلِ گل میں

چمن نے زردیاں پہنی ہوئی ہیں(۵)

زبان کاٹ کے کہتا ہے بولنے کے لیے

قرار چھین کے کہتا ہے ہے بے قرار نہ ہو(۶)

"حق" جس نے بھی کہا اُسے سولی چڑھا دیا

یا پھر اُسے حوالہ زندان کر دیا(۷)

کچھ ایسے توڑ دیے اعتبار لوگوں نے

جگر پہ داغ لگائے ہزار لوگوں نے

اسی نے ہاتھ میں کاسے تھما دیئے سب کے

بنا دیا جسے با اختیار لوگوں نے (۸)

گلگت اور بلتستان کے شعراء

نئے جادے اور نئی منزل کی جانب شوق کا قافلہ ہر دم رواں دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھیں اس بات کا شدید دکھ ہے کہ زمانے کے سیاسی نیرنگیوں کے باعث منزلوں پر ان لوگوں نے جابرانہ قبضہ کیا ہے جو سرے سے شریکِ سفر ہی نہ تھے۔ جس ماحول میں جاہل اور نااہل اپنی جہالت کا صلہ پا کر دندناتا پھرے ایسے سماج پر پہلے ہی فاتحہ پڑھ لینا چاہیے۔

زندگی کی

اس خارزارِ حیات میں جبر و استحصال اور ظلم و زیادتی کے ہاتھوں پسے ہوئے مجبور و لاچار انسان جس بے بسی اور بے کسی کے عالم میں سفر زیست کے مرحلے طے کر رہے ہیں ان کی حالت کسی طوفان میں بہنے والے تنکے سے کم نہیں۔ استحصالی نظام میں انسانیت حالات کے رحم و کرم پر ہے۔ ایسے ماحول میں گلگت اور بلتستان کے اردو شعراء نے انسانیت کی توہین، بے توقیری ، تذلیل اور تضحیک کرنے والے وحشی صفت ظالموں پر اپنی شاعری کے ذریعے نہ صرف حرفِ ملامت بھیجی ہے بلکہ ان کو خبر دار بھی کیا ہے کہ وہ جبر کے ہاتھوں پسے ہوئے طبقے کی مزید استحصال سے باز آجائے ورنہ انقلاب کی طوفان ان کی ایوانوں کی در و دیوار اکھاڑ کر رکھ دیں گے۔

گلگت بلتستان کے اردو شعراء نے سیاسی مزاحمتی شاعری کی ذیل میں گلگت بلتستان سمیت افقِ عالم کے جو منظر نامے دکھائے گئے ہیں ان منظر ناموں کی شکست و ریخت اور ڈوبتے ڈولتے تجربے دیکھ کر قاری لرز اٹھتا ہے۔ ان شعراء نے خوب صورت تشبیہات، استعارات، تلمیحات اور تراکیب کا استعمال کر کے صفحہ قرطاس کو رنگ ہائے گُل رنگ سے مزین

کیا ہے۔ صنائع بدائع، زبان پر خلاقانہ دسترس اور فنی مہارتوں سے گلگت اور بلتستان کے اردو شعراء کی شاعری ساحری کا روپ دھار لیتی ہے۔

سیاسی مزاحمتی

رویوں کی ذیل میں گلگت بلتستان کے اردو شعراء نے اپنی تخلیقی کامرانیوں سے اردو شاعری میں جو گرانقدر اضافہ کیا ہے اس کا ایک زمانہ معترف رہے گا۔

گلگت اور بلتستان کے ان جرّی

تخلیق کاروں نے سرِ صحرا جو حق و سچ کی اذان دی ہے اس کی گونج جبر و استبداد کے ایوانوں میں نہ صرف ہمیشہ لرزہ طاری کر دے گی بلکہ "شہرتِ عام اور بقائے دوام" کے بلند و بالا مرتبے پر فائز ہونے کے

ساتھ مذکورہ بالا تمام شعراء کا کلام ہمیشہ مایوس دلوں کو ولولہ تازہ عطا کرتا رہے گا۔

گلگت اور بلتستان کی دعوتِ فکر اور سیاسی شعور دیتی ہوئی حد درجہ دلکش و دلنشیں اردو شاعری نہ صرف نئے موڑ کے نرم و نازک زاویوں کی تھرتھراہٹیں اور لچک اپنے اندر رکھتا ہے بلکہ خیال کی ترتیب و پیشکش اور ترتیب کا کافی سامان اس میں موجود ہونے کے ساتھ اپنے زمانے کے لطیف ذہنی ردِ عمل کا سچا نمونہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

ب۔ گلگت اور بلتستان کی اردو شاعری میں سماجی مزاحمتی زاویوں کا تقابلی جائزہ

انسان تحفظ کا متلاشی ہے۔ تحفظ کی تلاش اس کی فطرت

میں شامل ہے۔ انسان شروع دن سے تحفظ کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تہذیب کے مختلف ادوار میں سماج لوگوں کو ضروری تحفظ فراہم کرتا رہا ہے۔ لیکن ہر دور میں اس کی نوعیت میں تبدیلی آتی رہی ہے۔ قدیم دور کے انسان معاشی ضرورتوں سے آگاہ نہ تھا۔ اس لیے

سادہ طرز زندگی اختیار کرتا تھا۔ لیکن ان کو جسمانی تحفظ کی ضرورت تھی۔ یہی احساس انھیں جنگلی درندوں اور جانوروں سے مقابلے پر آمادہ کرتی تھی۔ وہ اسی ضرورت کے پیشِ نظر ٹھنڈی ہواؤں، برف باری اور بارش سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے غاروں میں پناہ لینے پر مجبور تھا۔ مگر اس دور میں سماجی زندگی کا کوئی خاص تصور نہ تھا۔ اس لیے سماجی تحفظ کی بھی خاص ضرورت نہ تھی۔

امتدادِ زمانہ کے ساتھ انسان بھی چھوٹے چھوٹے قبیلوں، گروہوں اور خاندانوں میں تقسیم ہوتے گئے۔ یہیں سے سماج اور معاشرے کی تشکیل بھی عمل میں آئی۔ زمانے کے ساتھ ساتھ قبیلے چھوٹی بڑی ریاستوں میں تقسیم ہوتے گئے۔ ساتھ ہی ساتھ مختلف ریاستوں کا حکمران طبقہ بھی وجود میں آتا گیا۔ ابتدائی دور کے یہ حکمران کسی حد تک اپنے رعایا کی ضرورتوں کا خیال رکھتے تھے۔ معاشرے میں موجود بیواؤں، ضعیفوں، معذوروں اور بیماروں کو معاشرے سے الگ سمجھنے کی بجائے ضرورت مند سمجھ کر ان کا خاص خیال رکھتے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جس میں سماجی تحفظ کا نظریہ فروغ پا رہا تھا۔

جیسے جیسے زمانے نے ترقی کی۔ ویسے ویسے سماج کی ضرورتیں بھی بڑھتی گئی جس سے تحفظ کی ضرورت اور زیادہ اہم ہوگئی۔ زمانے کی ترقی کے ساتھ صنعتی دور کا آغاز ہوتے ہی مزدوروں کے حقوق کی تحفظ کے لیے مختلف تنظیمیں بنائی گئی۔ ان تنظیموں کی سفارشات کے ذیل میں مختلف قوانین بھی وضع کی گئی۔ یوں مختلف حلقوں کی طرف سے ورکروں کے حقوق کی پامالی اور ان کے ساتھ کی جانے والے ناانصافیوں کے خلاف باقاعدہ طور پر صدائے احتجاج بھی بلند کی جانے لگی۔ یوں سماج کے باشعور اہلِ قلم بھی ان سماجی ناانصافیوں کے خلاف اپنی تحریروں کے ذریعے احتجاج کرنے لگے۔

ڈاکٹر حسرت عبدالحق کاسگنجوی اسی ضمن میں ادیبوں کی منصب کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

"ادیب کا منصب یہ ہے کہ وہ اپنے معاشرے کی معاشی، ذہنی، معاشرتی، سماجی، تمدنی، سیاسی، اخلاقی اور تہذیبی اقدار کو فکر اور فلسفے کے سانچے میں اس طرح ڈالے کہ اس کی تخلیق زندگی کا ایک حصہ بن جائے۔ اس کی تخلیق ہمارے احساسات کو چھولے اور ہم میں جذبہ پیدا کرلے۔ ہمارے سوئے ہوئے احساسات کو جگالے، ہماری حمیت کو بیدار کرئے کہ ہم جذبوں، ولولوں، امنگوں اور نئے عزائم سے اپنی زندگیوں کو ترتیب دیں۔ ہم زندگیوں کی پیچیدگیوں کو اچھی طرح سمجھ جایں اور ایک نئے حوصلے اور جذبے کے ساتھ زندگی کے مسائل نبرد آزما ہونے میں فخر محسوس کریں"(۹)

کہا جاتا ہے احساس

سب سے بڑی دولت ہے۔ زندگی کی تمام تر قوتوں کا تحرک اور محرک احساس ہے۔ ایک شاعر کا احساس اس لیے زیادہ موثر ہوتا ہے کہ وہ شعور کی بنیاد پر حقیقتوں کا ادراک کرتا ہے تو زندگی کی تلخ حقیقتوں سے لے کر ابتدائی نوعیت کی نرم و نازک مسائل تک سب کچھ زیرِ بحث آجاتے ہیں۔ جس سے بڑھ کر انسان کی سوئی ہوئی حسیں جاگنے لگتی ہیں۔

مفاد پرستی، تن آسانیاں، خود غرضی

، جھوٹ، لالچ انسانی شعور کو زنگ آلود کر دیتی ہے۔ یہی چیزیں انسان کے اندر سے غیرت اور احساس کو سرے سے ختم کر دیتا ہے۔ اور انسان بے دست و پا ہو جاتا ہے۔ لہذا ایک باشعور شاعر کا فکری اساس اس احساس کو زندہ کرتی ہے۔ یوں وہ سماج میں انسانیت کی ترقی کے لیے قلم اٹھاتا ہے۔

ڈاکٹر حسرت عبدالحق اسی ضمن میں رقمطراز ہے:

"شاعری جزو ہست از پیغمبری ہو نہ ہو، لیکن زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے کا ذریعہ ضرور ہے۔ ذہن کی بالیدگی اور تازگی، موضوع کی گہرائی کا احساس اور پھر حوصلے اور ولولے، دردمندی کے ساتھ مل کر ایک بہتر معاشرے کا تصور پیش کرتے ہیں "(۱۰)

تلخ نوائی اردو شاعری میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ زندگی صرف خوشیوں سے ہی عبارت نہیں بلکہ دکھ

درد، حزن و یاس اور کرب و الم کا نام بھی ہے۔ کرب و الم کی درد اور کسک وہ سوغاتِ جاں ہے جسے ہر تخلیق کار اپنے سینوں سے لگائے رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے گلگت بلتستان کی اردو شاعری میں اپنے دور کی پُر پیچ زندگی کے ہر المیاتی موڑ کا سراغ ملتا ہے۔ سیاست بھی اس کے دائرہ کار سے باہر نہیں۔

پروفیسر ممتاز حسین یوں لکھتے ہیں:

"بغیر دکھ درد اور کرب کے کوئی ادب تخلیق نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ ادب کشمکش سے پیدا ہوتا ہے اور کشمکش میں کرب اور تکلیف کا پا جانا لازمی ہے۔ وہ کشمکش نئے سے نئے روپ اختیار کر سکتی ہے جس کی ہیئت سوسائٹی کے تضادات کی نوعیت سے متعین ہوتی رہی گی۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ انسان کا کوئی بھی عمل یا اس عمل کو کوئی بھی تہیہ بغیر کشمکش کے پیدا ہو"(۱۱)

گلگت اور بلتستان کی مزاحمتی شاعری بھی اسی قبیل کی شاعری ہے۔ گلگت بلتستان کے اردو شعراء کے دل میں جو جوش اور ولولہ ہے وہ ان کے تخلیقی جوہر کی اساس ہے۔ دراصل سماج کو پرکھنا اور جاننا شعور ہے۔ یہی شعور زندگی کی تاریخ کو نہ صرف پرکھتا ہے بلکہ اس کی بنیادی حقیقتوں کا اظہار بھی کرتا ہے۔ گلگت اور بلتستان کے شعراء نے اپنے زمانے کے پسِ پردہ محرکات کا اس حوالے سے برملا اظہار کیا ہے۔

شاعری پہلے انسان
کے جذبات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جذبات میں تغیر و تبدل انسان کے اندر داخلی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ یہی داخلی تبدیلی انسان کے ذریعے ماحول اور سماج میں تبدیلی اور انقلاب کا باعث بنتا ہے۔ اس لیے ادب اور شاعری کا براہ راست تعلق انسان کے جذبات سے ہے۔ ادب اور شاعری کا بنیادی کام ہی انسان کے جذبات کو منظم سانچے میں ڈال کر پیش کرنا ہے۔

شاعری میں اس قدر طاقت ہے کہ
شاعری انسان کی شعور کی تنظیم کرنے کے ساتھ اس کو بدلتا بھی ہے۔ شاعری میں جذبات اور شعور کا تعلق اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ جذبے میں شعور کے بغیر گہرائی پیدا نہیں ہوتی لیکن جذبے کے بغیر شاعری شاعری نہیں رہ سکتا۔ جذبہ بہ ذات

خود شعور کی شدت سے پیدا ہوتا ہے۔اور تخیل بھی شعور کا محتاج ہے۔ اس حوالے سے گلگت اور بلتستان کی اردو مزاحمتی شاعری جذبات اور شعور کی دولت سے مالامال ہے۔

سردار جعفری کے بقول:

"ادب نہ تو چند پیٹ بھروں کی میراث ہے، نہ ذہنی عیاشی کا سامان۔ بلکہ ادب عوام کی ملکیت ہے۔ اور اس پر زندگی سدھارنے اور سنوارنے کے مقدس فرائض عائد ہوتے ہیں۔ اور جدوجہد حیات میں ادب کو ایک حربے کے طور پر استعمال کرنا چاہیے۔ ادب کے مسائل بھی وہی ہیں جو زندگی کے مسائل ہیں۔ ادب کے موضوعات بھی زندگی کے موضوعات سے الگ نہیں ہوسکتے۔"(۱۲)

گلگت اور

بلتستان کے اردو شعراء کے ہاں سماجی مزاحمتی زاویوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ گلگت بلتستان کے اردو شعراء نے زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ بھوک، غربت، افلاس، سماجی ناانصافی، سماجی استحصال اور غلامی کے مسائل اس ضمن میں شامل کئے جاسکتے ہیں۔

سماج میں دو مختلف نظریات رکھنے والے

قلم کار اور تخلیق کار ہوتے ہیں۔ مثلاً کچھ نام نہاد اور جھوٹے تخلیق کار سامراج کے قصیدہ گوئی اور فاشسٹ نظریات کی پرچار کرتے ہیں۔ ایسے لوگ عوام سے دشمنی اور عناد رکھتے ہیں۔ فرقہ پرستی اور مذہبی تعصبات کو یہی لوگ ہوا دیتے ہیں۔ جبکہ حق گو اور حق پسند ادیب، تخلیق کار اور قلم کار سامراجیت اور جاگیرداری نظام کا خاتمہ کرکے ایک جمہوری معاشرے کی تشکیل چاہتا ہے۔ وہ ظلم، جبر، بربریت اور ناانصافی کا خاتمہ کرکے انسانیت کے لیے پرسکون منشا پیدا کرنا چاہتا ہے۔

انسانی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ہر زمانے میں انتہا پسندی سماج میں مختلف صورت میں رہی ہے۔ ہر دور میں یہ اپنی شکل وصورت اور ہیئت بدلتی رہی ہے۔ مثلاً سکیولر انتہا پسندی، سیاسی انتہا پسندیاور سماجی انتہا پسندی وغیرہ۔

جدید دور میں انتہا پسندی کے معنی و مفہوم بھی بدل گئے اور اب لفظ انتہا پسندی کو دہشت گردی کے مترادف ٹھہرایا گیا۔ دورِ جدید میں رائج انتہا پسندی یعنی مذہبی انتہا پسندی نے نہ صرف دین مبین کا چہرہ مسخ کر دیا بلکہ بھائی بھائی کا رگِ گلو بھی کاٹتے نظر آئے۔ اس مذہبی انتہا پسندی نے ہزاروں لوگوں کو بلا جرم و خطا موت کی نیند سُلا دیا۔

سن نوئے کی دہائی میں جنرل ضیاء الحق کی نافذ کردہ اسلامائزیشن نے وطن عزیز کو مذہبی انتہا پسندی کی زد میں لے لیا۔ جس نے آگے چل کر فرقہ واریت کا روپ دھار لیا۔ اس فرقہ واریت کی آگ نے ملک کے دوسرے شہروں کی طرح گلگت بلتستان کو بھی اپنے لپیٹ میں لے لیا۔ اور گلگت بلتستان کا مثالی امن تیزی کے ساتھ تباہی و بربادی کی جانب بڑھنے لگا۔ سن اٹھاسی کا دلخراش واقعہ اسی فرقہ وارنہ فسادات کا ایک شاخسانہ تھا۔ جس نے ایک طبقہ فکر پر لشکر کشی کر کے ظلم و بربریت کی انتہا کر دی۔ حاجی غلام محمد نادمؔ اپنی کتاب "یادوں کے دریچے" میں یوں لکھتے ہیں:

"جس وقت گلگت ہر حملہ ہوا، اُس وقت ہم ایر پورٹ کے قریب ایک مکان میں مقیم تھے۔ روزانہ تین چار سی ون ٹھرٹی جہاز ایر پورٹ پر اتر آتے اور غیر مقامی جتنے لوگ گلگت میں مقیم تھے، حتیٰ کہ گداگر تک کو طیاروں میں بھر بھر کر لے جا رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ سازشیں صرف مقامی لوگوں کے لیے ہو رہی ہے۔ جب ہم میڈیا والوں کے ساتھ جلال آباد پہنچے تو دیکھا کہ کھیتوں میں موجود بھیڑ بکریوں حتیٰ کہ پالتو مرغیوں تک کو نہیں بخشا گیا تھا۔ درختوں کو کیمیائی ادویات سے جلایا گیا تھا۔ ایک بڑھیا کی لاش کو ایک درخت پر الٹا لٹکایا ہوا تھا"(۱۳)

۳ جون ۲۰۰۴ء کو گلگت شہر میں نصاب کی تبدیلی کے خلاف ہنگامہ ہوا۔ جس کی وجہ سے گلگت کا امن ایک بار پھر خطرے میں پڑ گیا۔ اس طرح وقتاً فوقتاً ہنگامے اور فساد ہوتے رہے۔ یوں ۱۳ جنوری ۲۰۰۵ کو معروف عالم دین سید ضیاء الدین رضوی ساتھیوں سمیت شہید کر دیے گئے۔ اس سے فرقہ وارنہ فساد کی ایک نئی لہر پھوٹ پڑی۔ اس کے کئی سال بعد پیش آنے والے واقعات سانحہ لولوسر اور سانحہ چلاس گورنر فارم، جس میں نہتے مسافروں کو بسوں سے اتار کر خاک و خون میں غلطاں کر دیا، اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

انسانیت کا بے دردی سے ہونے والے قتل عام کا نظارہ کرنے والے گلگت بلتستان کے شعراء ان دلخراش واقعات سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکے۔یہی وجہ ہے ان واقعات کے اثرات ان کی تخلیقات میں نظر آتے ہیں۔چونکہ بلتستان کی بہ نسبت گلگت شہر ان فسادات کا مرکز رہا اس لیے گلگت کے شعراء ان واقعات سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔اور گلگت بلتستان میں قیام امن کے حوالے سے ان شعراء کا کردار مثالی رہا ہے۔

نائن الیون کا واقعہ تاریخِ بشریت کا ایک دلخراش واقعہ ہے۔اُس دن امریکہ میں معروف تجارتی مرکز ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر ہونے والے حملے میں عالمی امن کو ایک بار پھر سے خطرے سے دوچار کیا۔عالمی سپر طاقت امریکہ نے اس حملے کو جواز بنا کر دہشت گردی کے خلاف جنگ کی آڑ میں افغانستان اور اعراق پر ریاستی دہشت گردی مسلط کی۔جس سے وطن عزیز پاکستان براہ راست متاثر ہوئے۔

افغانستان میں قیام امن اور دہشت گردی کے خاتمے کے لیے پاکستان کا کردار مثالی رہا ہے۔لیکن پاکستان کا امن سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔اس لیے ملک کے دیگر شہروں کے شعراء کی طرح گلگت بلتستان کے شعراء نے ان ہولناک خون ریزیوں سے صَرفِ نظر نہیں کیا۔انہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے دہشت گردی کو نہ صرف تنقید کا نشانہ بنایا بلکہ اس بربریت کو عالم انسانیت کے زہر قاتل قرار دیا۔اور اس کے خلاف عوام میں بھرپور شعور اجاگر کرنے کی کوشش کی۔

افغان وار کے نتیجے میں پیدا ہونے والی

ملکی صورتِ حال دیکھ کر گلگت بلتستان کے شعراء ملک کے دیگر شاعروں کی طرح سخت تشویش کا شکار رہے۔یہی وجہ ہے ان کی تخلیقات میں ان حالات کے خلاف بھرپور مزاحمتی رویہ نظر آتا ہے۔مگر ان شعراء نے امید کا دامن بھی ہاتھ سے جانے نہیں

دیا۔ ان کے مطابق حق و باطل کی اس کشمکش میں فتح ہمیشہ حق کی ہی ہو گی اور باطل دفن ہو کر رہ جائے گی۔ ظلم و جبر، بربریت ،دہشت گردی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تباہی و بربادی کا نوحہ گلگت بلتستان کے شعراء کے ہاں کہیں کم تو کہیں زیادہ دیکھا جا سکتا ہے۔

ملائیت کسی بھی سماج کا وہ کردار ہے جو عالم کا لُبادہ اوڑھ کر مذہبی شدت پسندی ،تعصبات اور مسلکی اختلاف کو ہوا دیتے ہیں۔ شعور سے عاری سادہ لوح عوام جلدی ان کے بہکاوے میں آجاتی ہے۔یوں معاشرے کا امن تار تار ہو جاتا ہے۔ گلگت میں مولوی یا ملائیت مذہبی شدت پسندی کو ہوا دیتے رہے۔اس لیے گلگت کے شعراء کے ہاں ان کرداروں کے خلاف مزاحمتی رویہ نظر آتا ہے۔ جبکہ بلتستان میں فرقہ پرستی تو نہ ہونے کے برابر ہے البتہ اسلامی روایات سے انحراف کے خلاف یا اسلامی روایات کی پاسداری کے لیے علماء کردار ادا کرتے رہے۔لہذا روشن خیال شعرا ءیہاں شیخ یا ملائیت کا استعارہ استعمال کر کے ان کے خلاف مزاحمتی لہجہ اپناتے نظر آتے ہیں۔

گلگت کے اردو شعراء کی طرح بلتستان کے اردو شعراء کے کلام کا سماجی مزاحمت کی ذیل میں جائزہ لیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بلتستان کے شعراء نے دور افتادہ ، سہولیات سے محروم علاقے میں رہائش پذیر ہونے کے باوجود معاشرے میں ہونے والے اتار و چڑھاو سے صرف نظر نہیں کیا ہے۔ مثلاً ۲۰۰۲ میں نادرا نے شمالی علاقہ جات کے باسیوں کو مہاجر ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ اس اقدام کے خلاف نامور صحافی قاسم نسیم اپنی کتاب "صدائے شمال" میں یوں لکھتے ہیں:

قومی ڈیٹا بیس اتھارٹی نے گلگت بلتستان کے باشندوں کے لیے جاری کئے گئے نئے کمپیوٹرائزڈ قومی شناختی کارڈوں میں انھیں جموں کشمیر کا مہاجر قرار دیا ہے۔ نادرا کا یہ اقدام گلگت بلتستان کے باشندوں کو ایک بہت بڑے صدمے سے کم نہیں۔ کیونکہ نادرا کا یہ اقدام بظاہر گلگت بلتستان کے تاریخی حقائق کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اور گلگت بلتستان کے لوگوں کے لیے علیحدہ تشخص اور شناخت مٹانے کی ایک گہری سازش معلوم ہوتی ہے"(۱۴)

بلتستان کے نوجوان شاعر ذیشان مہدی نادرا کے اس اقدام پر خاموش رہنے والے سیاسی و سماجی رہبروں کو یوں ہدفِ تنقید بناتے ہیں:

جو رہبروں کی زباں پر ہے مہر خاموشی

تو کون بات کرے نادرا کے بارے میں(۱۵)

اسی طرح معرکہ کرگل کے نتیجے میں تباہ ہونے والی امن کی کوششوں کا درد محسوس کرتے ہوئے ذیشان یوں کہتے ہیں:

دو حاکمانِ وقت کی آپس کی جنگ میں

خنجر چلے ہیں سینہ کرگل پہ دوستو(۱۶)

مختصراً گلگت

بلتستان کے اردو شعراء نے سماج میں رائج جبری رجحان کے خلاف ردِ عمل کا اظہار کرتے ہوئے اپنے تخلیقات کے ذریعے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے معاشرے میں استحصالی رویوں، بدامنی، ناانصافی، ظلم و زیادتی، دہشت گردی ،عدالتی نظام اور معاشرے سے ختم ہوتی روحانی اقدار کے خلاف ردِ عمل کا بھرپور اظہار کیا ہے۔

شعراء معاشرے کے حساس ترین افراد میں ہوتے ہیں۔ وہ معاشرے کے حالات و واقعات کا بہ غور جائزہ لے کر اپنے تخلیقات کے ذریعے تمام حالات و واقعات معروضیت کے ساتھ پیش کرنا فرض عین سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گلگت بلتستان کے اردو شعراء نے معاشرے میں رائج عدم مساوات، بھوک، غربت، افلاس، ناانصافی، استبداد پسندی، مذہبی شدت پسندی، تعصبات اور ہنگامہ آرائی کے خلاف بھرپور مزاحمتی انداز میں ردِ عمل کا اظہار کیا ہے۔

ج۔ گلگت اور بلتستان کی اردو شاعری میں مزاحمتی سطح پر پائے جانے والے اشتراکات

گلگت اور بلتستان کی اردو شاعری میں درج ذیل اشتراکات پائے جاتے ہیں:

I. گلگت اور بلتستان کی اردو شاعری میں گلگت بلتستان کی سیاسی اور آئینی محرومیوں، وفاق پاکستان کی جانب سے کی جانے والی زیادتیوں کے خلاف مزاحمتی رویہ پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ مزاحمتی رویہ احتجاج کی حد تک ہے۔ بغاوت کے آثار بالکل نہیں۔

II. گلگت اور بلتستان کی اردو شاعری میں عالمی سیاسی منظر نامے، جبر و استبداد اور عالمی طاغوتی قوتوں کے خلاف مزاحمتی رویہ موجود ہے۔

III. گلگت اور بلتستان کے اردو شعراء نے بین الاقوامی سیاسی مسائل سے متعلق شعور اور ادراک کا مظاہرہ اگرچہ کم سہی لیکن اپنی تخلیقی شعور کے ذریعے ضرور کیا ہے۔

IV. گلگت اور بلتستان کی اردو شاعری میں کار فرما سیاسی و سماجی مزاحمتی زاویوں کا بغور جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ گلگت اور بلتستان کی اردو شاعری کا ترقی پسند نظریہ ادب سے وابستگی ضرور ہے۔

V. گلگت اور بلتستان کے اردو شعراء کے ہاں جبر و استبداد، سماجی مسائل، سماجی ناانصافیوں، معاشرتی برائیوں، معاشرتی ناہمواریوں، سیاسی ناانصافیوں اور سفاکیوں کے متعلق تلخ حقیقتوں کے آثار اور تجربات واضح نظر آتے ہیں۔ اس طرح گلگت اور بلتستان کی اردو شاعری میں سیاسی و سماجی شعور کا تجربہ بہ کثرت موجود ہیں۔

VI. گلگت اور بلتستان کی اردو شاعری میں انسانیت کی تذلیل، تضحیک، بے توقیری اور وحشی صفت ظالموں کے خلاف مزاحمتی لب و لہجہ پایا جاتا ہے۔

VII. سماجی مزاحمتی رویوں کی ذیل میں گلگت اور بلتستان کے اردو شعراء نے بھوک، غربت، افلاس، سماجی استحصال، معاشرتی ناانصافیوں اور غلامی کے مسائل اپنے اشعار کے ذریعے بیان کیے ہیں۔

VIII. گلگت بلتستان ایک عرصے تک مذہبی شدت پسندی کے نتیجے میں اٹھنے والے فسادات اور خون ریزیوں کی زد میں رہا۔ اس لیے یہاں کی اردو شاعری میں مذہبی منافرت، شدت پسندی، تعصبات، فرقہ واریت اور مسلک پرستی جیسے معاشرہ کش قبیح اعمال کے خلاف شدید مزاحمتی روش پائے جاتے ہیں۔

IX. گلگت اور بلتستان کے اردو شعراء نے عالمی اور ریاستی دہشت گردی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تباہی و بربادی کے خلاف اپنا مافی الضمیر اپنے اشعار کے وسیلے سے بیان کیا ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ یہاں کے اردو شعراء کے ہاں دہشت گردی کے خلاف مزاحمتی طرز اظہار پائے جاتے ہیں۔

X. گلگت اور بلتستان کے اردو شعراء نے عدالتی رویوں، ملک میں رائج نظام عدل اور عدالتی دوہرے معیار کے خلاف بھی کھل کر مزاحمتی روش اپنایا ہے۔

XI. سماج اور انسانی شعور میں تغیر و تبدل کے ساتھ شاعری میں پُرانے موضوعات بھی تبدیل ہو جاتے ہیں اور نت نئے موضوعات کا اضافہ بھی ہوتا ہے۔ اس حوالے سے گلگت اور بلتستان کی اردو شاعری میں موضوعاتی سطح پر ارتقاء پایا جاتا ہے۔

XII. ادب کے ماہرین کا خیال ہے کہ طنز انسانی تہذیب و تمدن کا پیمانہ ہونے کے اعتبار سے انسانی ہمدردی اچھے طنز کی دوسری شرط ہے۔ کسی بھی فنکار یا تخلیق کار کے ذہنی عمر، ارتقاء، تمدنی پسِ منظر اور سماجی تہذیب کا درست اندازہ طنز سے کیا جاتا ہے۔ ایک اچھا طنز نگار ایک بے رحم جرّاح ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ زندگی کی بدصورتی اور برے سماج کو بدلنا اس کا اصل ہدف ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں گلگت اور بلتستان کے اردو شعراء نے سیاسی و سماجی سطح پر پائے جانے والے معاشرتی برائیوں کو خوب تضحیک کا نشانہ بنایا ہے۔

XIII. گلگت اور بلتستان کے شعراء کو اکبر الہ آبادی کی طرح اہلِ مغرب کی کسی خوبی نے متاثر یا مرعوب نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے گلگت اور بلتستان کے اردو شعراء اہلِ مغرب کے طرزِ تمدن اور پاکستان سمیت گلگت بلتستان کے معاشرت پر مغربی تہذیب و تمدن کے اثرات کی بھرپور مخالفت کرتے نظر آتے ہیں۔

XIV. سیاسی و سماجی سطح پر گلگت اور بلتستان کی اردو شاعری میں انسان دوستی، عوامی بیداری اور شعور، جذبہ حریت اور حوصلہ آزادی، عوامی ہمدردی، انسان پرستی، عوامی بغاوت، لہو کا رنگ، حبسیہ ماحول اور سامراج مخالف موضوعات پر

مزاحمتی طرز اظہار ملتا ہے۔

XV. گلگت اور بلتستان کی اردو شاعری میں اپنے زمانے کی پُر پیچ زندگی کے ہر المیاتی موڑ کا سراغ بھی نمایاں طور پر ملتا ہے۔

XVI. مجموعی طور پر گلگت اور بلتستان کی اردو شاعری کا جائزہ لیں تو ایسے کئی شعری نمونے ملیں گے جس میں علاقائی اور ملکی سیاست کے مختلف بدلتے ہوئے رویے اور منظر نامے نظر آتے ہیں۔ یہ اشعار سیاسی اخلاقیات کی بڑی واضح انداز میں تصویر کشی کرتی ہیں۔

د۔ گلگت اور بلتستان کی اردو شاعری میں مزاحمتی سطح پر پائے جانے والے افتراقات

گلگت اور بلتستان کی اردو شاعری میں مزاحمتی سطح پر درج ذیل افتراقات پائے جاتے ہیں:

I. گلگت کے شعراء نے بلتستان کے شعراء کی نسبت گلگت بلتستان کی آئینی و سیاسی محرومیوں کو زیادہ محسوس کیا ہے۔ اس لیے گلگت کے اردو شعراء کے ہاں گلگت بلتستان کی آئینی و سیاسی محرومیوں کے حوالے سے زیادہ مزاحمتی اظہاریہ ملتے ہیں۔

II. بین الاقوامی سیاست اور مسائل کے متعلق تخلیقی شعور کا اظہاریہ اور تجربہ بلتستان کے اردو شعراء کے ہاں زیادہ پائے جاتے ہیں۔

III. دہشت گردی، شدت پسندی، مذہبی منافرت، مسلکی تعصبات، فرقہ واریت، عدمِ اتحاد جیسے سماج کُش اعمالِ بد کے خلاف گلگت کے شعراء نے زیادہ مزاحمتی روش اختیار کیا ہے۔ اس کے برعکس بلتستان چونکہ خطے میں امن کے حوالے سے مثالی رہا ہے۔ اس لیے بلتستان کے شعراء نے ان سماجی انقلابات کو کم محسوس کیا ہے۔

IV. سیاسی و سماجی شعور اور انقلابات کے تجربوں کا اگر بغور جائزہ لیں تو یہ تجربات بلتستان کے نوجوان شعراء کے ہاں نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

V. علاقائی تہذیب و تمدن، ثقافت اور اسلامی اقدار و روایات پر بیرونی ثقافتی یلغار کو بلتستان کے شعراء نے زیادہ محسوس کیا ہے۔ اس لیے گلگت کے شعراء کی بہ نسبت بلتستان کے شعراء کے ہاں اس حوالے زیادہ مزاحمتی اظہاریہ ملتا ہے۔

VI. خطے میں ایک عرصے سے قائم کشت وخون اور فسادات کے خلاف عوامی شعور اجاگر کرنے اور قیام امن کے حوالے سے گلگت کے شعراء کا کردار زیادہ رہا ہے۔

VII. مزاحمتی شاعری کا موضوعاتی سطح پر جائزہ لیں تو دو قدریں مشترک ہیں۔ عوام کی ذہن سازی اور سامراج دشمنی اور جبری طاقتوں کی مخالفت۔ گلگت بلتستان کی اردو شاعری کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ گلگت کے شعراء نے اس حوالے سے بہترین پیرایئے میں عوامی شعور بیدار کرنے کی سعی کی ہے۔

VIII. گلگت کے شعراء کی شاعری کا مرکز سیاسی واستحصالی نظام ہے۔ گلگت کے شعراء سماج میں عدم توازن، بگاڑ، بھوک ،غربت، احساسِ محرومی، فرقہ پرستی اور عدمِ انصاف غرض تمام مسائل کی جڑ اور ذمہ دار اسی سیاسی اور استحصالی نظام کو قرار دیتے ہیں۔ جبکہ بلتستان کی اردو شاعری داخلیت اور فطرت کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔

IX. بلتستان کی اردو شاعری کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔ بلتستان کے شعراء انسانی احساسات وجذبات، فطرت کی رنگینوں، دیہاتی مسائل حتیٰ کہ فلسفے کے خشک مباحث تک کو ضبطِ تحریر میں لاتے نظر آتے ہیں۔ جبکہ گلگت کے شعراء سیاسی واستحصالی نظام کو مرکز بنا کر سماجی مسائل کو نشان زد کرتے نظر آتے ہیں۔

X. موضوعاتی سطح پر بلتستان کی شاعری کی بہ نسبت گلگت کی اردو شاعری میں انقلابی موضوعات زیادہ پائے جاتے ہیں۔

XI. سیاسی وسماجی مزاحمتی زاویوں کے حوالے سے گلگت بلتستان کی اردو شاعری کا مجموعی جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ گلگت کی اردو شاعری میں سیاست اور سیاسی موضوعات اور مسائل سے متعلق مزاحمتی اظہاریہ ملتا ہے۔ جبکہ بلتستان کی اردو شاعری میں سماجی مسائل اور اس کے متعلقات کے خلاف مزاحمت واضح طور پر ملتے ہیں۔

گلگت اور بلتستان کی اردو شاعری میں متذکرہ بالا چیدہ چیدہ اشتراکات وافتراقات کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں ۔ کہ گلگت کی اردو شاعری میں یہاں کے ماحول کا پورا عکس واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ گلگت کے اردو شعراء نے نہ صرف فرد کی اندرونی احساسات اور نفسیاتی کیفیات کی ترجمانی کی ہے بلکہ فطرت کی بھرپور عکاسی بھی کی ہے۔ غرض گلگت کی اردو شاعری

میں تمام تر شعبہ ہائے زندگی اور تمام تر نظام ہائے زندگی کی خوب جھلک دکھائی دیتا ہے۔ یوں گلگت کی اردو شاعری کے مطالعے سے اس زمانے کے سیاسی، سماجی، معاشی اور دینی معاملات و تصورات اور خیالات کا مکمل پتہ چلتا ہے۔

بلتستان کے اردو شعراء نے اپنے دور کے سیاسی و سماجی مسائل اور ان کے سماج پر اثرات کا خوب نقشہ کھینچا ہے۔ یوں بلتستان کے اردو شعراء نے اپنے زمانے کے عصری حالات کو اپنے اشعار کے وسیلے سے محفوظ کیا ہے۔ یہ عصری حالات مزاحمتی انداز میں کبھی شکوے کا روپ دھار لیتی ہے تو کبھی مدعا کا انداز اختیار کر جاتی ہے۔

غرض گلگت بلتستان کے اردو شعراء کے فکر و فن پر ان کے ماحول کا اثر نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنے اشعار کے وسیلے سے اپنے دور کے زبوں حالی کا کھل کر مذاق اڑایا ہے۔ گلگت بلتستان کے شعراء کی طبیعت میں ہجو نگاری، شگفتگی، برجستگی اور شوخی کے لیے جولانی کیفیت ہونے کی وجہ سے ان کی شاعری میں تخیل کے ساتھ زور بیان پایا جاتا ہے۔

گلگت بلتستان کی اردو شاعری کا متذکرہ بالا خصوصیات کی بنیاد پر اردو ادب میں ایک نمایاں مقام رہے گا۔

حوالہ جات

۱۔ نسیم، محمد قاسم، مسئلہ کشمیر اور گلگت بلتستان، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷، ص ۱۰۵

۲۔ ایضاً، ص ۱۱۱

۳۔ طارقؔ، خوشی محمد، خواب کے زینے، ناشر: طارق سنز پشواڑی استور، ۲۰۰۰، ص ۲۶

۴۔ دانشؔ، احسان علی، ساحل مراد، ناشر: بزم علم و فن سکردو، ۲۰۱۸، ص ۲۲۸

۵۔ مشتاقؔ، حبیب الرحمٰن، ہوا نے چوڑیاں پہنی ہوئی ہے، ناشر: ہنی سارا پبلشنگ نیٹ ورک گلگت، ۲۰۰۲، ص ۳۱

۶۔ عاشق حسین عاشق، گمشدہ خواب، ناشر: میونسپل لائبریری سکردو، ۲۰۱۴، ص ۲۴

۷۔ ایضاً، ص ۲۶

۸۔ ایضاً، ص ۳۵

۹۔ کاسگنجوی، حسرت عبدالحق، ڈاکٹر، ادب، علمی اور فکری زاویے، کراچی، نفیس اکیڈمی اردو بازار، ۱۹۹۴، ص ۷۳

۱۰۔ ایضاً، ص ۶۴۱

۱۱۔ ممتاز حسین، پروفیسر، ادب اور شعور، کراچی، ادارہ نقدِ انقلاب، ۱۹۹۲، ص ۲۹

۱۲۔ سردار جعفری، ترقی پسند ادب، لاہور، مکتبہ پاکستان، س۔ن، ص ۵۴

۱۳۔ نادمؔ، غلام محمد، یادوں کے دریچے، ناشر ندارد، ۲۰۰۸، ص ۱۱۰/۱۰۹

۱۴۔ قاسم نسیم، صدائے شمال، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲، ص ۳۹۷

۱۵۔ ذیشان مہدی، نئے خواب کی خواہش، ناشر: بزم علم و فن سکردو، ۲۰۰۶، ص ۲۷

۱۶۔ ایضاً، ص ۵۵

باب پنجم

مجموعی جائزہ

الف۔ مجموعی جائزہ

مزاحمت انگریزی لفظ Resistance کا اردو ترجمہ ہے۔ لفظ مزاحمت اس وقت منظر عام پر آیا۔ جب دوسری جنگ عظیم کے دوران یورپ کے بہت سارے علاقوں پر جرمنی کے غاصب فوجوں نے قبضہ کر لیا۔ یوں یورپ کے لوگوں نے اپنے مقبوضہ علاقوں کو واپس لانے کے لیے جرمن آرمی کے خلاف مسلح جدوجہد شروع کی۔ اس عمل کو مزاحمت قرار دیا گیا۔ اور اس تحریک کو مزاحمتی تحریک کا نام دیا گیا۔

وقت اور حالات کے مطابق اس لفظ کی
اصطلاح مفہوم میں بھی تبدیلی واقع ہوئی۔ یوں آج مزاحمت کا مفہوم کسی چیز کو بچانے کے جدوجہد کرنا، کسی بات کو ماننے سے انکار وغیرہ مراد لیا جاتا ہے۔ یعنی اپنی جان، اپنے نظریات کے دفاع، وطن، مال، عزت اور آبرو کو بچانے کی خاطر کی گئی عملی اور فکری جدوجہد مزاحمت ہے۔

سماج میں انسان کو جبر کی بے شمار صورتوں سے آئے روز
واسطہ پڑتا ہے۔ ان میں سے تین صورتیں زیادہ اہم ہیں۔ اول صورت تو یہ کہ کوئی بیرونی طاقت کسی کی چار دیواری یا وطن پر

حملہ آور ہو جائے۔ چار دیواری پر حملے کی صورت میں صرف فرد کی جان و مال اور عزت و آبرو کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ جبکہ وطن پر حملہ آور ہونے کی صورت میں سماجی سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔

جبر کی دوسری صورت میں کوئی قوم خود ریاستی جبر کا شکار ہو جائے۔ عموماً بادشاہی یا مارشلائی نظام حکومت میں ایسے امکانات زیادہ واضح ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں سماج میں نہ صرف بنیادی انسانی حقوق سلب ہوتا ہے بلکہ لوگوں کی سیاسی، سماجی، معاشرتی آزادی چھن جانے کے ساتھ فکری اور نفسیاتی طور پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

جبر کی تیسری صورت یہ ہے کہ خود سماج کے اندر سے کوئی ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ معاشرے کا سیاسی و سماجی نظام خطرے میں پڑ جائے۔ عام طور پر ایسی تبدیلیوں کے پیچھے خارجی یا بیرونی طاقت کار فرما ہوتی ہے۔ ایسی تبدیلیاں عوام میں بے چینی کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ یوں عوام ان تبدیلیوں کے خلاف جدوجہد کرتا ہے۔ اس طرح مزاحمت کا عمل وجود میں آتا ہے۔

مزاحمت ایک دفاعی ردِ عمل کا نام ہے۔ کوئی عمل ہو گا تو ردِ عمل ہو گی۔ کسی فرد یا سماج کی مزاحمتی قوت اس وقت واضح صورت حال میں سامنے آئے گی جب اس پر کوئی بیرونی حملہ ہو۔ اگر حملہ نہ ہو تو فرد اور سماج کی مزاحمتی صلاحیت کو جانچنا ناممکن ہے۔ سماج میں مزاحمتی قوت بھی اس وقت سامنے آئے گی جب کوئی طاقت اس کے سیاسی ،سماجی اور معاشی نظام کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرے۔

مزاحمت حقیقت میں انسان کی سماج میں اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی شدید خواہش کا اظہار یہ ہے۔ اسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کسی کی مداخلت کے بغیر اپنی مرضی کے مطابق گزارنا چاہتا ہے۔ اسے کسی صورت یہ قبول ہی نہیں کہ اس کا حق کوئی دوسرا لے جائے۔

ماضی کی تاریخ اس بات کا حوالہ ہے کہ پرانے زمانے میں دفاع یا مزاحمت کی دو ہی ممکنہ صورتیں تھیں۔ ایک تو تلوار کے ذریعے دفاع کرنا یا جان بچانے کی خاطر راہِ فرار اختیار کرنا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ استحصال اور ظلم و زیادتی کے طریقے بھی تبدیل ہوتے گئے۔ یوں سماج میں مزاحمت کے رویوں میں بھی تنوع آتا گیا۔ آج کے جدید دور میں ٹریڈ یونینز اور سیاسی جماعتوں کا قیام بھی مزاحمت کا ایک طریقہ ہے۔ رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اب تو مزاحمت کے کئی اور طریقے بھی متعارف کیے گئے۔ اب تحریر، تقریر، جلسے اور جلوسوں کے ذریعے بھی مزاحمت اور احتجاج کیا جاتا ہے۔

کوئی سماج جبر و استحصال کا نشانہ بنتا ہے تو معاشرے کا ہر رکن اپنی اپنی دانست کے مطابق مزاحمتی رویہ اختیار کرتا ہے۔ یہ فریضہ ایک سپاہی سے لے کر استاد، دانش ور، فن کار، شاعر، ادیب غرض سب سرانجام دیتے ہیں۔ شاعر کا مزاحمت کے لیے ہتھیار اس کا قلم اور زبان ہے۔ لہذا وہ استحصالی طاقتوں کے خلاف اپنے قلم کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا ہے۔

ہر ادیب اور شاعر چونکہ معاشرے کا سب سے حساس ترین طبقہ ہوتا ہے۔ اس لیے یہ طبقہ ظلم کی کسی بھی قسم کو سماج میں آسانی سے قبول نہیں کرتا۔ یوں وہ اپنے قلم کے ذریعے مزاحمت کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔

گلگت بلتستان پاکستان کا وہ خطہ ہے جو کئی عشرے گزر جانے کے باوجود آج بھی قومی شناخت سے محروم ہے۔ اس لیے یہاں کے اردو شعراء نے گلگت بلتستان میں سیاسی و سماجی سطح پر ہونے والے ظلم و زیادتی، احساس محرومی، سماجی ناانصافی اور استحصالی طاقتوں کے خلاف اپنی اپنی دانست کے مطابق مزاحمتی فریضہ انجام دیے ہیں۔ ذیل میں ہم انہی منتخب شعراء کے ہاں سیاسی و سماجی سطح پر پائے جانے والے مزاحمتی طرز اظہار کا مجموعی جائزہ اختصار سے لیں گے۔

قرائن سے معلوم

ہوتا ہے کہ اردو زبان کے کئی ترقی پسند شعراء نے اردو غزل کو عصری حقائق کے اظہار کا وسیلہ بناتے رہے۔ اور اردو غزل کو

موضوعاتی قید سے آزاد کرانے میں اہم کا سر انجام دے چکے تھے۔ گلگت بلتستان کے اردو شعراء میں عبدالخالق تاجؔ اک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے ہمیشہ ممنوعہ زمینوں پر فصل کاشت کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے سچ کو ویسا ہی بیان کیا جیسا انھوں نے دیکھا تھا۔ شاہوں کے قصیدہ گوئی کی بجائے مظلوم و محکوم عوام کی ترجمانی کرتے رہے۔ سرمائیہ داروں، جاگیرداروں اور امیروں کے مفادات کے تحفظ کی بجائے کسانوں اور مزدوروں کی حمائیت اور ان کے حق میں ہمیشہ آواز بلند کی۔ عبدالخالق تاجؔ کی شاعری "شکستِ دل کی صدا بھی ہے اور سوز و یقین کی پکار بھی"، وہ اہلِ اقتدار اور جبری طاقتوں کے جاہ و جلال سے کبھی نہیں ڈرے۔ بلکہ شب کی تاریکیوں میں شب خون مار کر نقاب اوڑھنے والوں کے نقاب کو نوچ کر رکھ دیے۔ ان کی شاعری سراسر مزاحمتی شاعری ہے۔ ان کی شاعری سیاسی و سماجی سطح پر مزاحمت سے بھرپور شاعری ہے۔

گلگت بلتستان کے شعراء میں

جمشید خان دکھیؔ اک ایسے نباض کے طور پر سامنے آئے۔ جنھوں نے دن کی روشنی میں سرِعام ممنوعہ زمینوں کا رخ کیا۔ اور حق و صداقت اور عزم و شجاعت کی ایسی فصلیں کاشت کیں جس نے ان کے بعد آنے والے شعراء کے لیے سچ بولنا اور سچ کا راستہ اپنانا آسان کر دیا۔

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ دکھیؔ نے جو کچھ بھی بولا خلوص اور عزم و حوصلے سے بولا۔ یہ حیرت انگیز حوصلہ ایک تو انھیں سچ بولنے کی عادت اور اعتماد نے دیا۔ دوسرا گلگت بلتستان کے عوام بھی دیا جن کی سیاسی و سماجی استحصالی، محرومی اور بنیادی حقوق کی پامالی ان کی شاعری کی مرکزی موضوع بنی۔ اور انھی موضوعات نے انھیں وہ مقبولیت عطا کی کہ ان کی زندگی میں ہی گلگت بلتستان میں ایک لیجنڈ کے طور پر جانا گیا۔ اور انھیں گلگت بلتستان کا حبیب جالبؔ تسلیم کیا۔ جمشید خان دکھیؔ کو یہ عوامی مقبولیت اور پذیرائی آسمان سے یکدم کرم کی صورت نہیں ملی بلکہ ان کی عظیم سیاسی و سماجی جدوجہد، استحصالی نظام کے خلاف ان کی مزاحمتی رویے نے عطا کی۔

سینیر شاعر محمد امین ضیاء کا فنِ سُخن گوئی اور شعری وجدان عصری اور کلاسیکی شعری رویوں سے جڑا نظر آتا ہے۔ مجموعی طور پر ان کی شاعری میں انسان دوستی، رندی، مساوات، رومانیت، خود آگہی جیسے موضوعات کا تذکرہ اور سماجی کج رویوں کے خلاف مزاحمتی افکار نمایاں ہیں۔ ان کی شاعری میں غمِ انسانیت ایک خاص موضوع ہے۔ یہی وجہ ہے شہر گلگت کے مخصوص حالات کا درد ان کی شاعری میں واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔

خوشی محمد طارقؔ کا شمار گلگت بلتستان کے صفِ اول کے شعراء میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے قوتِ تخلیق سے اب تک دو شعری مجموعے شائع کیے ہیں۔ خوشی محمد طارقؔ نے گلگت بلتستان کی حبس زدہ فضا میں اردو غزل کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی شاعری میں صحت مندانہ شعری روایتوں کے ساتھ احساس کی تہہ دار اور شعری علامتوں کی نئی معنویت بھی ہے۔ انھوں نے اختراعی طاقت سے کام لے کر انسانی سیاسی و سماجی زندگی کے تلخ حقیقتوں کو شدتِ جذبات سے ہم آہنگ کر کے جس انداز میں شعری صورت میں بیان کیے ہیں وہ ایک لحاظ سے گلگت بلتستان کے مختلف سیاسی و سماجی ادوار کی ترجمانی کی ہے۔

ظفر وقار ظفرؔ نے

اپنی شاعری کی بنیاد جمالیات اور شعوری توانائی پر رکھی ہے۔ "آکاس" سے شروع ہونے والا شعری سفر "آنند" تک آتے انھیں زیادہ عرصہ نہیں لگا۔ یہ دونوں تخلیقات ان کے ایامِ جوانی کی شاعری پر مشتمل ہے۔ اسی لیے ان کا رجحان مزاحمتی کم اور رومانوی زیادہ ہے۔ انھوں نے کنایاتی، اور استعاراتی آمیزش کے ساتھ جو رومانی اور کلاسیکی رنگوں سے ہم آہنگ کر کے شاعری کے پیکر تراشتے ہیں وہ یقیناً قابلِ تحسین ہے۔

ظفرؔ کے شعری منظر نامے میں زندگی اور

جمالیاتی رویوں کے درمیان ہم آہنگی ہے۔ اس لیے ان کی بعض نظمیں جذبات آفرینی کے ساتھ داخلیت کے پہلوؤں تک لے جاتی ہیں جہاں جذبوں کی گہرائی ہے۔

حبیب الرحمٰن مشتاقؔ گلگت

بلتستان کا ایک روشن چہرہ ہے۔ وہ بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہے۔ مگر ان کے ہاں فنی پختگی اور جمالیاتی رچاؤ کی ہم آہنگی نے ان کی شاعری کو حقیقت اظہار سے قریب کر دیا ہے۔ حبیب الرحمٰن مشتاقؔ نے گلگت بلتستان کی فضاء میں اقدار کی پامالی، محبت کے جذبوں کی شکست وریخت، مادی ترقی کے اتار وچڑھاؤ، سماجی ناانصافی اور سیاسی انقلابات کے طلوع وغروب کے جو مناظر دیکھے ۔ان کو بڑی فن کاری سے شعری صورت میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے جبری طاقتوں کی سفاکیوں اور ہولناکیوں کے باوجود شعورِ عصر کو رہنما بنا کر فکر و نظر کے دیپ جلائے رکھا۔ اس لیے ان کی شاعری میں درد، کسک، شوق، تڑپ، حوصلے اور ولولے زیادہ نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے حبیب الرحمٰن مشتاقؔ کی غزلیہ شاعری کی امکانی حدیں آئندہ آنے والے دنوں میں عصری انقلاب کا پیش خیمہ ہو سکتی ہیں۔

انسانی

زندگی میں دکھ، مصیبتیں ، پریشانیاں ،خوشی اور آلامِ دہر ایک مسلمہ حقیقت ہے۔اس کے ساتھ سماج میں لالچ ، جھوٹ، منافقت، مفاد پرستی، سستی شہرت، اور دکھاوا جنم لینے لگتے ہیں۔ تو ایک حساس طبع شاعر کا ذہن اور فکر اس سے گہرا اثر لیتا ہے۔ ان سماجی برائیوں کی دھول میں سچ کہیں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ حساس شاعر سماج کی گہرائی میں اتر کر جب ان تمام حالات کا تجزیہ کرنے لگتا ہے تو نئے نئے انکشافات ہوتے ہیں۔ احسان شاہ کا شمار بھی ایسے شعراء میں ہوتا ہے جو گردوپیش کے حالات کا سنجیدگی سے جائزہ لیتا ہے۔ اس لیے وہ معاشرے میں رائج استحصالی نظام، جبر و ظلم اور انسانی مجبوریوں کا خوب صورتی کے ساتھ تجزیہ کرتا ہے۔ وہ زندگی کے تضادات اور تلخ حقیقتوں کا کچھ اس طریقے سے تجزیہ کرتا ہے کہ قاری ان صداقتوں میں نہ صرف کھو جاتا ہے بلکہ وہ خود کو ایک فریق بھی گردانتا ہے۔

احسان شاہ کو دکھی انسانیت کی خدمت، ان کا عزم و حوصلہ ،انسانیت کی بقا کی جدوجہد انھیں احتجاج اور مزاحمت پر اکساتا ہے۔ یہی وہ عوامل ہیں جو ان کے جذبے کو آفاقیت کے منزل سے ہمکنار کرتے ہیں۔

ایک باشعور اور باضمیر انسان

جب ذاتی شعور، آگہی، ادراک اور احساس کو لے کر زندگی سے قدم ملاتا ہے تو اس کی شخصیت کا وزن نہ صرف کلام میں نمایاں ہوتا ہے بلکہ اس کی شخصیت کا پرتو ان کی طرز نگارش اور اسلوب میں بھی نمایاں ہوتا ہے۔ اکبر حسین نحویؔ کا تعلق بھی ایسے قبیل سے ہیں جو اک ایسے معاشرے کی تشکیل چاہتا ہے جس میں انسانیت کی عزت اور عظمت کا احساس ہو۔ جہاں لوگوں کو یہ بات سمجھائی جاسکے کہ کیا اچھا ہے اور کیا بُرا۔

اکبر حسین نحویؔ کی ذہنی بالیدگی اور پختگی میں ان عصری شعور اور آگہی رہنمائی کرتے ہیں۔ جس میں وہ حساس دل کے ساتھ گردوپیش کے حالات کا کھلی آنکھوں کے تجربات کی روشنی میں مشاہدہ کرتے ہیں تو ان کا عصری شعور اور بھی نمایاں انداز میں نکھر کر سامنے آتے ہیں۔ نحویؔ ایک ایسا شاعر ہے جو حبس زدہ اور گھٹن زدہ معاشرے میں اجالوں کا متلاشی ہے۔ وہ انسانی زندگی سے تمام تر برائیوں کا خاتمہ چاہتا ہے۔ ان کے ہاں حق و باطل کی تضاد اور کشمکش زیادہ نمایاں ہیں۔ اس کے لیے وہ کربلا کو بطور استعارہ استعمال کرتا ہے۔ نحویؔ کی شاعری میں سماجی سطح پر مزاحمت زیادہ ہے۔ اس لیے انھوں نے زندگی کی تلخیوں، سماجی کھردراہٹ اور ظلم وزیادتیوں کو جس طرح نظموں اور غزلوں کے پیرایے میں بیان کیے ہیں وہ صرف مزاحمتی ہی نہیں بلکہ ان میں تعمیر کا جذبہ بھی موجزن ہے۔ جو ان کی خلوصِ نیت کی علامت ہے۔

ایک اچھا تخلیق کار وہی ہے جو سماجی احساسات کی بنیاد پر معاشرے کے دکھ درد کو سمجھ کر شاعری میں اس طرح سے پیش کرے جو دلوں پر اثر انداز ہونے والی سوز و گداز میں بدل جائے۔ ایک نبض شناس سخنور ہی معاشرے کی برائیوں اور خامیوں سے پردہ اٹھاتا ہے۔ اور سماج سے ان برائیوں کے سدِباب کے طریقوں سے معاشرے کو آگاہ بھی کرتا ہے تاکہ معاشرہ ترقی کر سکے۔ سرزمین گلگت کی سیاسی و سماجی فضاء ہمیشہ بوجھل اور غبار آلود رہی ہے۔ اس پر تضادات، بے یقینی اور کشمکش کی دھول اڑتی رہی ہے۔ عبدالحفیظ شاکرؔ نے ان تمام سماجی تضادات اور کشمکش کو گہرائی کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ ان کے

ہاں سماجی سطح پر مزاحمت زیادہ ہے۔ان کا شعری رجحان سراسر مزاحمتی ہے۔ان کی شاعری انسانی معاشرے کے چہرے سے نقاب اٹھاتا ہے۔ ان کے قلم میں معاشرہ بینی اور انسان شناسی کے بڑے بڑے گُر پوشیدہ ہیں۔انھوں نے بھوک، غربت افلاس، رشوت، امیری، فقیری، فرقہ واریت، مذہبی فتنے، ظلم وزیادتی، ناانصافی غرض تمام سماجی خامیوں کا احاطہ اپنی شاعری میں کیا ہے۔ان کا شمار گلگت بلتستان کے صفِ اول کے مزاحمت کار شعراء میں کیا جاسکتا ہے۔

عبد الکریم کریمیؔ کا شمار گلگت

بلتستان کے نوجوان شعراء میں ہوتا ہے۔اگرچہ ان کا شعری سفر طویل نہیں۔اب تک ان کے دو شعری مجموعے منظر عام پر آئے ہیں۔ لیکن عصری شعور، اظہارِ ذات اور احساسِ خیال کی توانائی سے وہ آشنا ہیں۔ان کے ہاں غزل کی روائیت کا اظہار بھی مناسب طور پر ملتا ہے۔ مجموعی طور پر کریمیؔ کی شاعری میں مزاحمتی رجحان کم اور رومانی زیادہ ہے۔ مگر پھر بھی سماجی مسائل اور اتار وچڑھاؤ سے انھوں نے چشم پوشی نہیں کی۔جو کچھ انھوں نے مشاہدہ کیا یا محسوس کیا وہ کچھ بیان کیا ہے۔وہ سماج میں انسانی زندگی کے بدلتے گوشوں پر بخوبی نظر رکھتے ہیں اور انھیں خوب صورتی کے ساتھ شعری مالا میں پرو کر پیش کرتے ہیں۔

بلتستان

کے سینیر شعراء کے صف میں راجہ محمد علی شاہ صباؔ کو "سرتاجِ ادب" کا مقام حاصل ہے۔راجہ محمد علی شاہ صباؔ شعوری طور پر ہمیشہ جدید شاعری کی طرف متوجہ رہے۔ ترقی پسند شاعر داخلی معاملات کی بجائے خارجی مسائل کا شاعر ہوتا ہے۔خارجی مسائل کی شاعری اعلیٰ درجے کی شاعری اس وقت بنتی ہے جب تک شاعر باہر کی دنیا کے مسائل کو دل سے محسوس کر کے پیش نہ کرے۔

راجہ صباؔ کی نظم نگاری کی امتیازی وصف یہ ہے کہ اول تو ان کی شاعری سراسر خارجی مسائل کی شاعری نہیں۔ لیکن جہاں ان کی شاعری میں خارجی مسائل اور موضوعات بیان ہوئے ہیں۔ان میں بھی انھوں نے داخلیت کا رنگ پیدا کر دیا

ہے۔راجہ صاحب نے سیاسی و سماجی سطح پر جو نظمیں لکھی ہیں ان کا اندازِ بیان رومانی ہے۔ان نظموں کے مطالعے سے یوں محسوس ہوتا ہے۔جیسے وہ عشقیہ جذبات کا اظہار کر رہے ہوں۔راجہ صباؔ کے ہاں جو نرمی اور دردمندی ان کی رومانوی شاعری میں ہے وہی ان کی سیاسی شاعری میں بھی ہے۔لیکن وہ مایوسی کا اظہار نہیں کرتے۔ان کی شاعری انسانیت کے روشن مستقبل کی شاعری ہے۔راجہ صباؔ ملک کے سیاسی و سماجی مسائل اور حالات سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔یہی وجہ ہے ان کا عصری شعور خوب صورتی کے ساتھ ان کی شاعری میں جلوہ گر ہیں۔مجموعی طور پر ان کی شاعری میں جمالیات کا عنصر غالب ہے۔تاہم سماجی مسائل سے بھی روگردانی نہیں کی۔اس لیے ان کی شاعری میں سماجی سطح پر مزاحمت ملتے ہیں۔

بلتستان کے پہلے

اردو صاحبِ دیوان شاعر سید اسدؔ زیدی کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔وہ مغربی نظریات سے بھی خوب آشنا تھے۔اس لیے ان کی شاعری میں جہاں مزاحمتی پہلو ہے وہاں ترقی پسندانہ نظریات کار فرما ہیں۔اسدؔ زیدی بلتی اور اردو دونوں زبانوں کے قادر الکلام شاعر تھے۔ان کی شاعری کی انفرادیت اچھوتے خیالات ہیں۔سید اسدؔ زیدی چونکہ خود ایک سیاسی طور پر متحرک سیاسی رہنما تھا۔اس لیے انھوں نے ذاتی مفادات کو کبھی سامنے نہیں رکھا۔انھوں نے ہمیشہ دن کو دن اور رات کو ہمیشہ رات ہی لکھا۔شاہوں کے قصیدے لکھنے اور مدح سرائی کی بجائے عوامی جذبات کی ترجمانی اپنے اشعار کے وسیلے سے کی ہیں۔جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے مفادات کے تحفظ کی بجائے کسانوں اور مزدوروں کی حقوق کے لیے ہمیشہ آواز بلند کرتے رہے۔ان کی شاعری میں سیاسی سطح پر مزاحمت دیکھا جاسکتا ہے۔

موضوعاتی سطح پر شاعری میں یدِ طولیٰ رکھنے والے پُرگو شاعر پروفیسر حشمت علی کمال الہامی کا شمار گلگت بلتستان کے صفِ اول کے شعراء میں ہوتا تھا۔انھوں نے تمام اصنافِ سُخن میں طبع آزمائی کی۔لیکن ان کی نظموں اور غزلوں میں سیاسی مزاحمت کم ہے۔تاہم سماجی سطح پر ہونے والی بدعنوانیوں،کرپشن،اقربا پروری،نظام عدل اور انسانی رویوں کے خلاف

مزاحمت ان کی شاعری میں ملتی ہے۔ رباعیاتِ کمال الہامی اس بات کا واضح ثبوت ہے۔ انھوں نے سماجی اور عوامی مسائل کو اپنے رباعیات کے ذریعے بہت خوب صورتی کے ساتھ بیان کیے ہیں۔

غلام حسن حسنیؔ کی شاعری میں کارفرما مزاحمتی پہلوؤں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ حسنیؔ نظریے کا شاعر ہے۔ اس لیے وہ نظریے کا انسان ہے۔ انسانی زندگی کی قدریں حسنیؔ کو بہت زیادہ عزیز ہے۔ اس لیے وہ ظلم، ناانصافی، بے قاعدگی، اخلاقی پستی، تعیش پسندی، اور سماجی ناہمواری کا دشمن ہے۔ یہی وجہ ہے وہ سفر حیات میں ہر اُس شخص کا ہم سفر بنا جو ان قدروں کے ساتھ چلتا ہے۔ لیکن جہاں ان قدروں سے اس کا دامن چھوٹتا ہے حسنیؔ آن سے علحیدگی اختیار کر لیتا ہے اور اپنے فکر و فن کے نشتروں سے اس کو ادھیڑ دیتا ہے۔

بلتستان سے تعلق رکھنے والے جمالیت پسند شاعر احسان علی دانشؔ کی شاعری کا جائزہ لینے معلوم ہوتا ہے کہ فکری طور پر احسان دانشؔ روایت پسند شاعر ہے۔ ان کی شاعری میں رومانیت اور جمالیات کا عنصر غالب ہے۔ "شکستہ ناؤ" سے شروع ہونے والا تخلیقی اور شعری سفر "ساحلِ مراد" تک آتے آتے احسان دانشؔ کو کم و بیش اٹھارہ سال لگے۔ ان اٹھارہ سالہ تخلیق سفر کے باوجود وہ رومانیت اور جمالیات پسندی کا فکری رجحان دامن سے لگائے نظر آتے ہیں۔ احسان دانشؔ کی شاعری میں سیاسی سطح پر مزاحمت کم دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اپنے گرد و پیش کے حالات اور سماجی ناہمواریوں پر مضبوطی سے گرفت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے وہ اپنی شاعری میں مزاحمتی رویہ اپناتے ہوئے سماجی ناہمواریوں پر تاک کر نشانہ لگاتے نظر آتے ہیں۔

یہ بات سچ ہے کہ "اردو ادب کی جڑیں ماضی میں ہوتی ہیں"۔ اس لیے ایک سچے تخلیق کار کے لیے ضروری ہے کہ وہ

حال سے رابطہ بحال رکھنے کے لیے ماضی کے تہوں میں قدم رکھ کر مستقبل اور اس کے امکانات تلاش کریں۔ مگر یہ تلاش اور جستجو ان کی تخلیقی صلاحیت، اختراع اور قوتِ فکر پر منحصر ہے۔

محمد افضل روشؔ اپنے شعری نظام کے لیے ایک ایسا خانہ تیار کرتے ہیں جس میں موجود خوب صورت تلازمات، تشبیہات، استعارات اور مشاہدات کو پڑھ کر متنوع مفاہیم سامنے آتے ہیں۔ روشؔ کی شاعری میں خیال، احساس اور حقیقت تین ایسی بنیادیں ہیں جن کے ذریعے وہ زندگی کے خارجی اور داخلی مسائل سامنے لاتے ہیں۔ فن سُخن گُوئی میں افضل روشؔ کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ ان کی شاعری میں کسی قسم کا سوقیانہ پن نہیں۔ بلکہ وہ ظلم ،جبر ،ناانصافی ،جمہوریت ، آمریئت، عدالتی نظام انصاف، معاشرتی اقدار، سماجی بدلتی اور معدوم ہوتی اقدار کے خلاف مزاحمت کرتے نظر آتے ہیں۔

افضل روشؔ کا اصل ہدف

انسانی زندگی کی بنیادی قدروں کی حفاظت ،انسان دوست سماج کی تشکیل، اور سچائی کا تحفظ ہے۔ روشؔ کی شاعری میں صرف معاشرے کا دکھ درد نہیں اور کرب نہیں بلکہ پسِ پردہ مسکراہٹیں، مسرتیں، یقین اور زندگی کا تصور بھی ہے۔ اس لیے ان کی شاعری میں مزاحمتی لہجہ نمایاں ہونے کے باوجود ہمہ گیریت کی فضاء ملتی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ افضل روشؔ کی شاعری حقیقت اور عصری تقاضوں سے قریب تر ہے۔

قیام پاکستان کے بعد جدید اردو شعراء نے فکر و رومان اور شدتِ جذبات کے ساتھ علامت اور استعارں کو بنیادی حیثیت دے کر نئے الفاظ کے سانچوں میں ڈھال کر غزلیہ شاعری کی امتیازی حد بندی کی۔ ناصرؔ کاظمی سے لے کر دورِ جدید کے جواں سال شاعروں کے کلام کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی غزلیہ شاعری میں ایک ایسا ارتقائی دھارا ملتا ہے جس میں

معاشرتی بندھن، تہذیبی رشتے، سیاسی مصلحت بندی، اور سماجی دباؤ کے دائرے ملتے ہیں۔ اس ضمن میں دیکھا جائے تو انھی شعراء کے قافلے میں ذیشانؔ مہدی بھی شامل ہے۔

ذیشانؔ مہدی کی شاعری میں عصری حسیت، شگفتگی، اور شاعرانہ دلربائی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں فکر و احساس، ہجر و فراق اور تجربوں اور مشاہدوں کی باریک بینی کی بنیاد پر جو شعری فضاء استوار کیا ہے۔ اس میں سادگی اور پرکاری ہونے کی وجہ سے اسے ہم فکری صداقت کہہ سکتے ہیں۔ یہی وہ بنیادیں ہیں جس کی وجہ سے ذیشان مہدی کی فکری کینوس میں اضافہ ہونے کے ساتھ ان کے شعری رویوں میں احساس مندی، دردمندی اور آفاقیت پیدا ہو گئی ہے۔

ان کی شاعری میں مسلسل ارتقاء کی کیفیت نظر آتی ہے۔ ذیشانؔ مہدی کی شاعری کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کی شاعرانہ بصیرت اور واضح عصری شعور نے ان کی شاعری میں وہ توازن پیدا کیا ہے جس کی بنیاد پر ان کے اشعار رجائیت کا اظہار کرتے ہیں۔ صداقت عصر اور صداقتِ فکر کے آمیزش نے ان کی شاعری کو اس مقام تک پہنچا دیا ہے جو "ماضی کی گھپاؤں" سے فکر کے سورج طلوع کرتے ہیں اور دورِ حاضر کی تاریکیاں دور کرتے ہیں۔

ذیشانؔ کی شاعری میں جہاں رومانوی پہلو نمایاں ہے۔ وہیں سیاسی و سماجی سطح پر رونما ہونے والے انقلابات سے وہ بے خبر بھی نہیں۔ یہ ان کی پختہ سماجی اور سیاسی شعور کی واضح دلیل ہے۔

نوجوان شاعر عاشق حسین عاشقؔ کی شاعری میں المیاتی احساس کی شدت توانائی کے ساتھ موجود ہے۔ انھیں تضادات سے بھرپور زندگی کا مکمل احساس ہے۔ ان کی وجدان اور تراشیدہ عصری شعور نے ان کی فکر کو متحرک کر دیا ہے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے پیکر آفرینی، آگہی کی صورت گری اور بیدار حسیت کا احساس ہے۔

دورِ حاضر کا شاعر خوفِ تردد اور عصری غیر محفوظیت سے دوچار تو ہے لیکن فرسودہ رویوں اور نظریوں کے خلاف اس کی مزاحمتی جدوجہد بھی جاری ہے۔ عاشق حسین عاشقؔ اسی قبیل میں شامل ہے۔ انھوں نے زندگی کے مدّ و جذر کا عمیق مشاہدہ کرتے ہوئے، آنکھیں کھلی رکھ کر، شعور کو آزادانہ اور رضاکارانہ طور پر استعمال کرتے ہوئے، دشواریوں اور صعوبتوں کا سامنا کرتے ہوئے زندگی کو شعوری اور عقلی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

انسانی تاریخ گواہ ہے کہ آمریت کے ہر دور میں سچ کو زندہ رکھنے کے لیے سقراط زہر پیتا رہا ہے۔ لیکن سچائی سماج میں کسی نہ کسی صورت میں زندہ رہی ہے۔ ہر حق پسند شاعروں نے اپنے تجربات، مشاہدات، اور قوتِ فکر کی بنیاد پر آمریت کے خلاف نہ صرف احتجاج کی بلکہ ظلم و ستم کے خلاف ڈٹے رہے۔ عباس سفیرؔ انہی حق پسندوں کے قبیل سے ایک ایسا نوجوان شاعر ہے۔ جنھوں نے اظہار، حریتِ فکر، شدتِ احساس اور اخلاصِ فکر کے ساتھ منفرد شعری اسلوب میں ظلم و ناانصافی اور جبر کے خلاف مزاحمتی رویہ اختیار کیا۔ انھوں نے آمریت اور جبری طاقتوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے بصارت اور بصیرت کے امتزاج سے فکر و خیال کی شمعیں روشن کی ہیں۔ ان کے دل و دماغ کی سوچ مثبت ہے۔

عباس سفیرؔ کی شاعری میں حقیقت نگاری اس روپ میں نظر آتی ہے کہ انھوں نے سماجی ناانصافی اور عدمِ مساوات کو شاعری کا موضوع بنا کر معنوی انقلاب کے تجزیے کیے ہیں۔ جس کا مقصد فکر اور سوچ کو معنوی اعتبار بخشنا ہے۔ سفیرؔ کی شاعری میں سیاسی اور سماجی مزاحمتی پہلو زیادہ ہے۔ تاہم رومانی شاعری بھی ان کی فکری خمیر میں موجود ہے۔ انھوں نے محبت اور حقیقت کی آمیزش سے جو شعری فضاء قائم کی ہے اس کے پسِ پردہ محرکات میں انسانی تواریخ کا وہ المیہ ہے جو ہر زمانے میں رہی ہے۔ اس لیے انھوں نے سماجی شعور اور سیاسی بلوغت کو فکر و سخن کا محور بناتے ہوئے ادراک اور آگہی کو نیا زیور عطا کیا ہے۔

میر آفتخار کا شمار گلگت بلتستان کے نوجوان شعراء میں ہوتا ہے۔انھوں نے سیاسی، معاشی اور سماجی زندگی کے پسِ منظر میں نئے شعری افق تلاش کرنے کی بھرپور سعی کی ہے۔ان کی شاعری عہد حاضر کا تجزیہ کرتی ہے۔انھوں نے اپنی نظموں میں زندگی کے بے شمار مسائل کا احاطہ کیا ہے۔میر آفتخار کے ہاں جمالیت پسندی کا عنصر ہونے کے باوجود ان کا شعری رجحان مزاحمتی اور ان کا لہجہ مزاحمت سے بھرپور ہے۔ان کی شاعری میں ترقی پسندانہ نظریات زیادہ ہیں۔یہی وجہ ہے انھوں نے خیر وشر اور سیاسی وسماجی رویوں کی بھرپور انداز میں منظر کشی کی ہے۔

میر آفتخار کی شاعری

متحرک شاعری ہے۔جو عصری تقاضوں کو بھرپور انداز میں پورا کرتی ہے۔انھوں نے گردوپیش کے مسائل کو اسی انداز میں بیان کیا ہے جس انداز میں انھوں نے مشاہدہ کیا ہو۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ابہام سے پاک ہے۔

مجموعی طور پر گلگت بلتستان کی اردو شاعری کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت واضح ہوتا ہے کہ یہاں کے اردو شعراء نے اپنے کا فن کا سفر طلوعِ آزادی کے بعد گردوپیش پیدا ہونے والے صورتِ حال اور ترقی پسند نظریات کے جلو میں پیش کیا ہے۔گلگت بلتستان کی اردو شاعری میں کار فرما سیاسی و سماجی زاویوں کے مطالعے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی اردو شاعری کا ترقی پسند ادب سے وابستگی ضرور ہے۔

گلگت

بلتستان کے اردو شعراء نے کسی بھی مصلحت کا شکار ہوئے بغیر جس دیدہ دلیری اور بے باکی سے حقائق دیانت داری اور خلوص کے ساتھ بیان کر کے جو تخلیقی معیار یہاں کے شعر وادب میں قائم کیے ہیں وہ ہر حوالے سے قابلِ رشک کام ہے۔

گلگت

بلتستان کے اردو شعراء نے حبس زدہ اور مغلوب زدہ ماحول میں حقیقت شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تاریکی میں ڈوبے ہوئے

شہر کے مکینوں کو ارد گرد کے حالات و واقعات سے باخبر رکھنے کی بھرپور سعی کی ہے۔ یہیں سے گلگت بلتستان کے اردو شعراء کے کارنامے اور شاعری کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہیں۔

گلگت بلتستان کے

اردو شعراء نے صرف سیاسی و سماجی ناہمواریوں، سفاکیوں اور جبری داستانوں کو ہی بیان نہیں کیا بلکہ ہمارے عہد کی غنائی شاعری کی روائیت کو بھی زندہ رکھتے ہوئے اسے مزید پُر اثر بنانے کی بھرپور سعی کی ہے۔ اس لیے یہاں کی اردو شاعری میں انقلاب، سماجی شعور، سیاسی شعور اور غنائیت کے پہلو بہ کثرت موجود ہیں۔

کسی بھی معاشرے میں رہائش پذیر شعراء اپنے ماحول کا باریک بینی کے ساتھ جائزہ لے کر اپنے اشعار کے سہارے سماجی مسائل کو بیان کرنا فرضِ اولین سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے گلگت بلتستان کے اردو شعراء نے سماج میں رائج بھوک، غربت، عدمِ مساوات، سماجی استحصال، ناانصافی، ظلم و زیادتی، دہشت گردی، استبداد پسندی، مذہبی منافرت، نظامِ عدل، معدوم ہوتی سماجی قدریں اور ہنگامہ آرائی کے خلاف بھرپور مزاحمتی انداز اپناتے ہوئے ردِ عمل کا اظہار کیا ہے۔

اردو ادب میں وہی شاعری مقبولِ عام ہوئی جس میں غزل کا رنگ نمایاں ہو۔ گلگت بلتستان کی اردو شاعری کی انفرادیت یہ ہے کہ ایک تو یہاں کی شاعری زیادہ تر غزلیہ شاعری ہے۔ دوسری طرف ان شعراء کے ہاں موضوعاتی تنوع بھی پایا جاتا ہے۔ کیونکہ ہر بدلتے سماج اور سیاسی منظر نامے کے مطابق شعری موضوعات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ یہاں کے شعراء کی اپنی زمین اور معاشرت سے جڑت زیادہ ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ یہ شعراء اپنے معاشرے میں ایک عام آدمی کے دکھ درد کو سمجھتے بھی ہیں اور ان پر احتجاج بھی کرتے ہیں۔

گلگت بلتستان کے اردو شعراء نے سماج میں رہتے ہوئے مزاحمت کار کا فریضہ بھی انجام دیا ہے اور مصلح کا کردار بھی۔ گلگت بلتستان کے شعراء کا یہ امتیازی وصف ہے کہ انہوں نے افراد پر تنقید کرنے کی بجاے سماج میں رائج رویوں کے خلاف مزاحمت کی ہے۔ یہ ان کی شعور کی پختگی کی علامت ہے۔

مطالعاتی سطح پر گلگت بلتستان کی اردو شاعری میں کارفرما سیاسی و سماجی مزاحمتی زاویوں کا جائزہ لیا جائے تو ان کے موضوعات وہ تمام کے تمام ہیں جو اپنے زمانے کی سیاست اور سماج میں زیرِ بحث ہیں۔ تاہم یہاں کی شاعری میں مبالغے کا رجحان بہت کم ہے۔ ویسے بھی مبالغہ اس وقت کیا جاتا ہے جب کسی مضحک صورتِ حال، رویے یا کیفیت کو بیان کرنا مفقود ہو۔

گلگت بلتستان کی اردو شاعری کی اس پہلو سے بالکل انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہاں کے شعراء نے اپنی شاعری میں اپنے زمانے کے سیاسی و سماجی صورتِ حال کو محفوظ کر لیا ہے۔ اس لیے یہاں کی شاعری کا مطالعہ کر کے گلگت بلتستان سمیت ملکی سیاسی و سماجی صورتِ حال بخوبی علم ہوتا ہے۔

گلگت بلتستان کی اردو شاعری میں کارفرما مزاحمت، سیاسی و سماجی سطح پر رائج رویوں کی پیداوار کہا جاسکتا ہے۔ بلاشبہ یہاں کی شاعری دیکھی ہوئی حقیقت کو مدبرانہ انداز میں بیان کرتی ہے۔

گلگت بلتستان کے شعراء کے اس فن کارانہ خوبی سے انکار کسی طور ممکن نہیں کہ ان شعراء نے معروضی روش اختیار کرنے کے باوجود شاعری کی بالواسطہ زبان سے رشتہ قائم رکھا۔ اور استحصالی طاقتوں، جبری نظام، ظلم و استبداد، آمریت اور احساسِ محرومی کی گھناؤنی تصویر پیش کر کے انسانی وقار کو مجروح نہیں کیا۔ بلکہ انھوں نے شاعری کی زبان میں ان تمام تر

خطروں کو بھانپ کر ان کی طرف عوام کو متوجہ کیا جو معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ رہے تھے۔ اور ان کو روکنے کے لیے فوری طور پر عمل ضروری تھا۔ اس عظیم مقصد کے تحت گلگت بلتستان کے اردو شعراء نے رواں دواں بحروں کو ٹکڑوں میں بانٹ کر حقیقیت کے جراحت کے لیے طنز اور مزاحمت کو اس سلیقے سے برتا کہ عوامی شعور سیاسی و سماجی سطح پر نہ صرف متاثر ہوا بلکہ سماج میں تبدیلی کا موجب بھی بنا۔

ب۔ تحقیقی نتائج

اس تحقیق کے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آئے ہیں:

۱۔ گلگت بلتستان کی اردو شاعری کا سیاسی و سماجی مزاحمتی زاویوں کی بنیاد پر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی شاعری میں مزاحمت ایک بنیادی رویے کے طور پر سامنے آتی ہے۔

۲۔ سیاسی مزاحمت کی ضمن میں گلگت بلتستان کی اردو شاعری میں ظلم و زیادتی ،نا انصافی ،جبر و استبداد، آمریت، احساسِ محرومی اور آئینی حقوق سے محرومی کے خلاف مزاحمت پایا جاتا ہے۔

۳۔ سماجی مزاحمت کی ذیل میں گلگت بلتستان کی اردو شاعری میں پس ماندہ، ظلمت کی چکی میں پسے ہوئے مظلوم لوگوں کے دکھ درد، ان کے سماجی و معاشی سطح پر استحصال ،نا انصافی، طبقاتی کشمکش ،بھوک، غربت، کسانوں اور مزدروں کے حقوق کی پامالی، انسانی رویے ،عدالتی نظام انصاف اور دیگر سماجی مسائل پر مزاحمتی رویہ سامنے آیا ہے۔

۴۔ گلگت بلتستان کی اردو شاعری میں دہشت گردی، مذہبی منافرت، فرقہ واریت، مسلکی تعصبات، اور مذہبی شدت پسندی کے خلاف بڑے پیمانے پر مزاحمتی رجحان پایا جاتا ہے۔

۵۔ گلگت بلتستان کی اردو شاعری زیادہ تر غزلیہ شاعری پر مشتمل ہے۔ اس لیے گلگت بلتستان کے غزل گو شعراء کے ہاں سیاسی و سماجی مزاحمت یکساں طور پر اپنے اپنے عہد اور زمانے مطابق ابھرتا ہے۔

۶۔ سیاسی و سماجی مزاحمت کی ذیل میں گلگت بلتستان کی اردو شاعری میں ارتقاء پایا جاتا ہے۔

۷۔ مزاحمتی شاعری کی ذیل میں گلگت بلتستان کی اردو شاعری میں بغاوت کے آثار کم اور احتجاج زیادہ نظر آتا ہے۔

۸۔ گلگت بلتستان کے اردو شعراء نے فکری سطح پر مزاحمتی رویہ اختیار کرتے ہوئے ادب کے جمالیاتی تقاضوں کا مناسب لحاظ رکھا ہے۔ انھوں نے شعری افکار کی ترسیل کے دوران فکر و فن اور شعری جمالیاتی روایت کو مجروح نہیں ہونے دیا ہے۔

ج۔ سفارشات

درج بالا تحقیق کی روشنی میں مندرجہ ذیل سفارشات پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ تنقید ادب پر صیقل کرتی ہے اور اس کی دھار کو کبھی کند نہیں ہونے دیتی۔ گلگت بلتستان کی اردو شاعری اور ادب پر اب تک تنقیدی کام بالکل نہیں ہوا ہے۔ لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ گلگت بلتستان کی اردو شاعری اور ادب پر جامعاتی سطح پر تنقیدی مقالات لکھنے کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ گلگت بلتستان کی اردو شاعری میں کارفرما رومانوی شاعری پر ابھی تک کسی بھی حوالے سے کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ لہذا اس سلسلے میں تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

۳۔ گلگت بلتستان کو دنیا کے خوب صورت ترین علاقوں میں شمار اجاتا ہے۔ یہاں کے شعراء نے اپنی تخلیقات کے ذریعے فطرت کی بھرپور انداز میں منظر کشی کی ہے۔ اس لیے گلگت بلتستان کی اردو شاعری میں فطرت نگاری کے عنوان پر کام کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ دوران تحقیق یہ بات سامنے آئی ہے کہ گلگت بلتستان کے اردو شعراء کا اہلبیت اطہارؑ اور واقعہ کربلا سے دلی وابستگی ہے۔ اس لیے گلگت بلتستان کی اردو شاعری پر واقعہ کربلا کے اثرات کا جائزہ لیا جائے۔

۵۔ گلگت بلتستان میں اردو رثائی ادب پر اب تک کسی بھی حوالے سے کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ اس ضمن میں اس موضوع پر تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

۶۔ گلگت بلتستان کی اردو شاعری کا فکر و فن اور لسانی اعتبار سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

۷۔ گلگت بلتستان کی اردو شاعری میں کار فرما مزاحمتی رویوں کا ملک کے دیگر مزاحمتی شعراء کے تخلیقات کے ساتھ تقابل بھی کیا جائے۔

۸۔ گلگت بلتستان میں قیام امن کے حوالے سے یہاں کے قلم کاروں بالخصوص شعراء کا بڑا کردار ہے۔اس لیے قیام امن کے حوالے سے گلگت بلتستان کے شعراء کے کردار کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

کتابیات

بنیادی مآخذ

الف۔شعری مجموعے

احسان شاہ، برف کے صحراوں میں، پاکستان فکری تحریک گلگت، مارچ ۱۹۹۲

احسان شاہ، میرا خواب زیرِ چراغ تھا ہنی سار پبلیشنگ نیٹ ورک گلگت بلتستان ۲۰۰۵

دانشؔ، ساحلِ مراد، بزمِ علم و فن سکردو، ۲۰۱۸

دانشؔ، احسان علی، شکستہ ناؤ، ناشر ندارد، ۲۰۰۱

ذیشانؔ مہدی، درد کی پہلی دھوپ، یونیورسل پرنٹرز سکردو، ۱۹۹۹

ذیشانؔ مہدی، نئے خواب کی خواہش، بزم علم و فن سکردو، جنوری ۲۰۰۱

روشؔ، محمد افضل، درد پا، احمد پرنٹنگ پریس راولپنڈی، ۲۰۰۴

زیدی، سید اسد، رنگِ شفق، الیاس پرنٹرز راولپنڈی، ۱۹۸۶

شاکرؔ، عبدالحفیظ، زندگی، گلگت ہنزہ پرنٹنگ پریس، ۲۰۱۷

شاکرؔ، عبدالحفیظ، میں نہیں ہوں، ناشر ندارد، ۲۰۰۸

ضیاء، محمد امین، سروشِ ضیاء، ضیاء پبلی کیشنز گلگت، ۲۰۱۰

طارقؔ، خوشی محمد، پلکوں کے سائباں، طارق سنز پشواری منی مرگ گلگت جنوری ۱۹۹۷

طارقؔ، خوشی محمد، خواب کے زینے، ایضا، ۲۰۰۱

ظفرؔ، ظفر وقار، آکاش، ہمالیہ پبلیشرز انٹرنیشنل، جون ۱۹۹۸

ظفرؔ، ظفر وقار، آنند، الحکمت پرنٹرز کراچی، بتعاون حلقہ ارباب ذوق گلگت جنوری ۱۹۹۷

عباس سفیرؔ، بانگِ صبحِ انقلاب، مہناج العلم پبلی کیشنز، ۲۰۱۵،

عباس سفیرؔ، سراب، معراج الدین پرنٹر لاہور، س۔ن

کریمیؔ، عبدالکریم، تیری یادیں، کاروان نگر غذر، ۲۰۱۱

کریمیؔ، عبدالکریم، شائید پھر نہ ملیں ہم، کراچی زیڈ اے پرنٹنگ، ۲۰۰۸

مشتاق، حبیب الرحمٰن، کوئی موجود ہونا چاہتا ہے، ادبی انجمن فکری تحریک گلگت، ۲۰۱۲

مشتاق، حبیب الرحمٰن، ہوا نے چوڑیاں پہنی ہوئی ہے، ہنی سار پبلیشنگ نیٹ ورک گلگت، ۲۰۰۲

میر افتخار، قلم سوزی ارمان، ماورا پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۱

نحویؔ، اکبر حسین، حرفِ رفو، الجواد پرنٹر راولپنڈی، ۲۰۱۶،

الہامی، پروفیسر، حشمت علی کمالؔ، رباعیاتِ کمالؔ، ملک پرویز پرنٹر لاہور، ۲۰۱۰ء

ب۔ رسائل وجرائد

انتخاب گلگت بلتستان (سہ ماہی)، شمارہ نمبر ۲، جلد نمبر ۱، یکم اکتوبر تا ۳۱ دسمبر ۲۰۰۲ء

انتخاب صباؔ نمبر (سہ ماہی) گلگت بلتستان، شمارہ نمبر ۱، جلد نمبر ۲، اگست تا اکتوبر ۲۰۰۳ء

موج ادب (سہ ماہی) گلگت بلتستان، کمال الہامی نمبر، شمارہ ۲ تا ۱۴، اپریل ۲۰۱۵ تا اپریل ۲۰۱۸

ج۔ غیر مطبوعہ

حسنیؔ، غلام حسن، بادلوں کا سفر، غیر مطبوعہ

حسنیؔ، غلام حسن، غزلیاتِ حسنی، غیر مطبوعہ

ثانوی مآخذ

الف۔ کتابیں

ابو اللیث صدیقی، تجربے اور روایت، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، س۔ن

احمد، کلیم الدین، نئی شاعری (حصہ دوم)، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۷

احمد فرازؔ، (کلیات) شہر سخن آراستہ ہے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۳

اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال، عثمان پبلی کیشنز ۲۰۰۰

برچہ، شیر باز خان، تذکرہ اہل قلم و شعرائے گلگت، راولپنڈی، ٹی۔ ایس پرنٹر، ۱۹۸۹

برچہ، شیر باز خان، عکسِ گلگت بلتستان، گلگت، نارتھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۳

حبیب جالبؔ، کلیاتِ حبیب جالبؔ، ماورا پبلیشرز لاہور، ۱۹۹۳،

حسرتؔ، محمد حسن، بلتستان تہذیب و ثقافت، ناشر ندارد، ۱۹۹۵

حسرتؔ، محمد حسن، تاریخ ادبیات بلتستان، ناشر ندارد، ۱۹۹۲

حسین محمد جعفری، سید، ڈاکٹر / احمد سلیم (مرتبین) پاکستانی معاشرہ اور ادب، پاکستان اسٹڈی سنٹر جامعہ کراچی، ۱۹۸۷

دانشؔ، احسان علی، شمال کے ستارے، رومیل ہاوس آف پبلی کیشنز راولپنڈی، ۲۰۱۴،

رشید امجد، ڈاکٹر، شاعری کی فکری و سیاسی روایت، مطبع: طیب اقبال پرنٹر لاہور، ۱۹۹۳

رشید امجد، ڈاکٹر (مرتبہ)، مزاحمتی ادب اردو، اسلام آباد، اکادمی ادبیات، ۲۰۰۹

سبط حسن، سید، نویدِ فکر، مکتبہ دانیال کراچی، طبع ششم، ۱۹۹۰،

سردار جعفری، ترقی پسند ادب، لاہور، مکتبہ پاکستان، س۔ن

سوزن بیسنٹ، تقابلی ادب ایک تنقیدی جائزہ، مترجم: توحید احمد، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۱۵

شاعری کی سیاسی و فکری روایت، دستاویز مطبوعات، لاہور، ۱۹۹۳

شیدا، راجندر ناتھ، ادب فکر اور سماج، ہندوستان لیتھو پرنٹنگ پریس دہلی، ۱۹۷۲، ص ۷

طارق کلیم، ڈاکٹر، اردو کی ظریفانہ شاعری میں مزاحمتی عناصر، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۱۸

عظمیٰ سلیم، ڈاکٹر، گلگت بلتستان کی زبانوں کا جائزہ، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۷

عظمیٰ سلیم، ڈاکٹر، شمالی علاقہ جات میں اردو زبان و ادب، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۸

فضل امام (مرتب)، انتخاب کلیات جوشؔ پبلیشر ندارد، س۔ن
کاسگنجوی، حسرت عبدالحق، ڈاکٹر، ادب، علمی اور فکری زاویے، کراچی، نفیس اکیڈمی اردو بازار، ۱۹۹۴
کلیم الدین احمد، اردو شاعری پر ایک نظر، نئی شاعری، حصہ دوئم، نیشنل بک فاونڈیشن اسلام آباد، ۱۹۸۶
گلگت بلتستان کا اردو ادب، حصہ نثر و شاعری، ناشر حلقہ ارباب ذوق گلگت، ۲۰۱۱
متاز حسین، پروفیسر، ادب اور شعور، کراچی، ادارہ نقدِ انقلاب، ۱۹۹۲
محسن نقوی، ریزہ حرف، ماورا پبلیشرز لاہور، ۲۰۱۲،
منگلوری ممتاز، ڈاکٹر، مختصر تاریخ زبان و ادب گلگت بلتستان، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۹
مہرؔ، غلام رسول، آزادی گلگت بلتستان، راولپنڈی، ون پبلیشرز، ۲۰۰۴
نادمؔ، غلام محمد، یادوں کے دریچے، ناشر ندارد، ۲۰۰۸
نسیم، قاسم نسیم، صدائے شمال، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲
نسیم، محمد قاسم، گلگت بلتستان اور مسئلہ کشمیر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷
نوازش، محمد خاور، (مرتبہ) ادب زندگی اور سیاست، مثالی پبلی کیشنز فیصل آباد، ۲۰۱۲،

ب۔ لغات

اوکسفرڈ اردو انگریزی لغت، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۳
علمی اردو لغت، علمی کتاب خانہ لاہور، ۱۹۹۶
فرہنگِ تلفظ، مرتبہ شان الحق الحقی، ادارہ فروغ قومی زبان اسلام اباد، ۲۰۱۷،

ج۔ رسائل و جرائد

امتزاج Issue 1,Vol 5، ۲۰۱۸، شعبہ اردو جامعہ کراچی،

امتزاج Issue 1,Vol 4، ۲۹ اگست ۲۰۱۹، شعبہ اردو جامعہ کراچی،

اخبار اردو، شمارہ ۸، ۷، جلد ۱۹، جولائی تا اگست، ۲۰۰۳، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد

انتخاب گلگت بلتستان (سہ ماہی)، شمارہ نمبر ۲، جلد نمبر ۱، یکم اکتوبر تا ۳۱ دسمبر ۲۰۰۲،

انتخاب صبا نمبر، شمارہ نمبر ۱، جلد نمبر ۲، اگست تا اکتوبر ۲۰۰۳،

د۔ غیر مطبوعہ مقالات

عابد حسین، گلگت بلتستان میں اردو شاعری: تجزیاتی مطالعہ (مقالہ ایم فل)، نمل یونیورسٹی، اسلام آباد ۲۰۱۶

لیاقت علی، محسن نقوی کی مزاحمتی شاعری، مقالہ (ایم فل اردو)، غیر مطبوعہ، جی سی یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۸،

وسیم کشفی، اردو میں مزاحمتی اور انقلابی شاعری (مقالہ ایم۔فل)، قومی ادارہ برائے مطالعہ پاکستان قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد، ۱۹۹۴